حاجی لق لق کے افسانے

حاجی لق لق

مکتبۂ اردو لاہور

پگڈنڈی

(افسانے)

افضل عابدی

ناشر

اِشاعت گھر۔ حیدرآباد دکن

سلسلۂ مطبوعات اشاعت گھر۔ شمارہ نمبر (۹)

بارِ اوّل ۱۹۴۴ء

تعداد طبع ایک ہزار

مالکان اشاعت گھر

غوث محی الدّین (عثمانیہ)

چندر سین جائیسوال

قیمت
عال
۸ر

امجد یوسف زئی کے نام

فہرست

چالیس روپیہ

چالیس روپیہ آئے اور گئے۔ پھر آئے اور پھر گئے۔ اس چکر میں اُن سے ایک کہانی بن گئی۔ اسی کا واقعہ سناتا ہوں۔

آپ واگیش کو جانتے نہ ہوں مگر نام تو سنا ہوگا۔ آدمی وہ کچھ یوں ہی سا ہے خیر۔ وہ اپنے کانپور سے الہ آباد جا رہا تھا۔ اُترا اور تانگہ کے قریب پہونچا تو دیکھتا ہے کہ ایک عورت اس کے پیچھے کھڑی ہے۔ گڑگڑا رہی ہے۔ شاید کچھ چاہتی ہو۔ گود میں بچہ ہے۔ میلی کچیلی ساری ہے۔ جس کو سر پر کھینچ کر آدھا گھونگٹ سا بنا لیا ہے۔

واگیش (یہ اُس کا ادبی نام ہے) کو اس قسم کی باتیں اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ اسے چھین لینا اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن مانگنا برا۔ ایک دفعہ کرتہ کے نیچے کی جیب میں رومال پڑا تھا جس میں کچھ پیسے تھے۔ کسی نے اُسے ایسا صاف کھینچ لیا کہ کیا بات ہے! یہ واگیش کو اچھا معلوم ہوا۔ اس کے جی میں آیا کہ اگر وہ منہ ملے تو اُسے کچھ انعام دے۔ آخر یہ بھی ایک ہاتھ کی صفائی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا صاف جیب کٹا کہ کیا کہنا! اسکے بعد بلیڈ (BLADE) لے کر اس نے اپنے کوٹ پر خود مشق کی کہ وہ صفائی مجھے بھی نصیب ہو۔ جیب کسی کا کاٹنا تو نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے مگر ہاتھ کی صفائی تو آنی چاہیے۔ اس خیال سے جناب نے اس کوٹ کو جگہ جگہ سے نشتر لگا کر چاک چاک کر دیا۔ لیکن آخر تک تشفی نہیں ہوئی اور نہ اس فن کار کی خوبی کا سواں حصہ ہی آپ کی تراش میں آسکا۔ اس ناکامی سے دل میں خیال ہوا کہ اگر

کوئی استاد گرہ کٹ ملے تو اس سے اصل ترکیب سیکھ لوں گا۔

لیکن یہ کیا کہ گڑگڑا کر مانگا جا رہا ہے۔ اس نے غصہ سے کہا کیا ہے! ہٹو ہٹو" لیکن وہ عورت ہٹی نہیں بلکہ اور پیچھے ہو گئی۔ تانگہ میں بیٹھتے بیٹھتے واگیش نے جھلا کر کہا "کیا ہے۔ پیسہ میرے پاس نہیں ہے۔ چلو راستہ دیکھو"

تانگہ میں بیٹھنے کے بعد واگیش کو آدھے گھونگٹ میں سے اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ ٹھوڑی پر گودنا تھا۔ عمر ہوگی کوئی پچیس برس۔ بدصورت نہ تھی۔ خوبصورت تو تھی ہی نہیں۔ نیک چلن نہ ہوگی۔ گود سے چمٹے ہوئے بچے کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور ہاتھوں پر کھرونچے۔ واگیش نے ڈانٹ کر کہا "چلو ہٹو جاؤ"۔

تانگہ والے نے کہا "چلوں بابو جی"۔

عورت نے ہاتھ پھیلا دیا۔ بولی "تمہاری آل اولاد جیئے بابو جی۔ دھن دولت زیادہ ہو۔ بچہ بھوکا ہے۔ اس کا باپ نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔!" "تو مانگتی کیوں ہو کام کرو۔ یہ تانگہ کیوں پکڑ رکھا ہے۔ چھوڑ دو ہٹو" "کام کیا بابو۔۔۔ تمہارے بال بچے سلامت رہیں" "کام کرو کام۔ حرام کا نہیں کھاتے"

اس حرام اور کام کے مطلب کو تو وہ خود بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ جب عورت نے اسکے جوتوں میں بندھے ہوئے پیر پکڑ لئے تو گھبرا کر وہ انھیں پیچھے گھسیٹ لیا۔

"ہیں! یہ کیا کرتی ہو۔ بولو۔ کام کرنے کو تیار ہو۔"

"ہاں بابو"

اس وقت واگیش گویا خود ہی پھنس گیا۔۔۔ کہنے لگا "تو چلو میرے ساتھ تمہیں کام مل جائے گا۔"

دو روز کیلئے الہ آباد آیا تھا۔ دوست نے پوچھا کہ یہ کیا نئے قسم کا سامان اپنے ساتھ لے آئے ہو۔ اس سوال کا واگیش کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکا۔ کہنے لگا "اُس سے چکّی پسواؤ جی۔ ایسے لوگ تو کام چور ہوتے ہیں۔ چکّی سامنے آتے ہی یہ اپنا راستہ لے گی"۔

دوست کو تعجب ہوا لیکن واگیش خود بھی حیرت زدہ معلوم ہو رہا تھا۔

دوست نے کہا "واگیش! تم عجیب آدمی ہو۔ ہمیشہ اپنے پیچھے ایک نہ ایک بلا مول لیتے پھرتے ہو"۔

واگیش نے کہا "مول کہاں لیتا ہوں۔ خریدنے کیلئے خرچ کی ضرورت ہو تو کیا پھر بلا ہی مول لوں؟ لیکن بغیر خریدے جو سر پڑے اس کا کیا علاج ہے؟ دیکھو، ماں اور بچے کیلئے ایک ساری اور قمیص ٹھیک سی نکلوا دو اور ان کے جسم پر کے کپڑے آگ کی نذر کرنے کیلئے کہہ دو"۔

خیر اس طرح پہلا دن گذر گیا۔ نئے کپڑوں میں وہ عورت بھی نئی ہو گئی۔ کام سے اس نے جی نہیں چرایا۔ آٹھ سیر گیہوں پیسے جس کی مزدوری اسنے دو آنے دی۔ کچھ اُس نے چرخہ کاتا۔ کوٹھی میں جھاڑو دی۔ اور تھوڑا سا بچوں کا کام بھی سنبھالا۔

واگیش کو اس پر غصہ آگیا۔ وہ سمجھا تھا کہ جو ایک دفعہ آوارہ ہو اُٹھا اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ اس لئے جھک مار کر یہ آپ ہی بھاگ جائیگی۔ چلو بلا سر سے ٹل جائے گی۔ اس بات کا اُسے یقین تھا۔ جب اس کا یقین غلط نکلا تو وہ دل ہی دل میں اس عورت سے ناراض ہوا۔

دوسرے روز صبح کے وقت وہ برآمدے کے باہر آرام کرسی پر بیٹھا تھا ہاتھ میں اخبار تھا لیکن وہ پڑھ نہیں رہا تھا۔ دل میں اس وقت کوئی بات نہ تھی۔ کل کی بات کا اسے خیال آتا تھا کہ کام کرنا چاہیئے۔ حرام کا نہیں کھانا چاہیئے۔ یہ اچھی طرح سے اسکی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کل سے آج تک جو اس نے کام کیا ہے وہ کام ہے یا حرام۔ کل اُس نے شام کے وقت موٹر میں سوار ہوکر کرسی پر بیٹھ کر ڈیڑھ گھنٹہ تک ایک جلسہ کی صدارت کی تھی۔ آخر میں کچھ بولا بھی تھا۔ اس زحمت کیلئے اس کا بیحد شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا۔ یہ کام ہے کہ حرام؟ وہ یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

وہ عورت برآمدے میں جھاڑو دے رہی تھی اسے دیکھتے ہی واگیش نے غصہ سے کہا "یہاں آؤ" عورت نے سر اونچا کیا۔ ٹھٹکی اور پھر سر نیچا کئے جھاڑو دیتی رہی۔

واگیش نے "یہاں آؤ" کہنے کے ساتھ ادھر رُخ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ اور غصہ سے سامنے والے بغیچہ ہی کو دیکھ رہا تھا۔ جب کوئی پاس نہ آیا تو اس نے اور بھی گرج کر کہا "اِدھر آؤ"

یہ سن کر جھاڑو چھوڑ ساڑی سر پر سنبھالتی ہوئی وہ عورت اسکے قریب آگئی۔ اس دفعہ گھونگٹ بہت آگے جھکا ہوا تھا۔ واگیش کو بُرا معلوم ہوا۔ اسکے دل میں خیال ہوا کہ یہ پردہ بھی عیبوں کو ڈھانکتا ہے۔

بولا "تم اب کیا چاہتی ہو"۔

عورت نے آنکھیں نیچی کر کے اور ساڑی کا ایک کونہ تھامی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔ جواب نہیں دیا اس نے۔

گیا چاہتی ہو اب تم جا سکتی ہو"

عورت نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

"دیکھو! میں کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ یہ میرا گھر نہیں ہے، اس لئے تم آج شام تک جا سکتی ہو۔"

واگیش نے دیکھا کہ اب بھی وہ کچھ جواب نہیں دے رہی ہے تو کہنے لگا "دوسروں کے گلے پڑنا اچھی بات نہیں۔ نہ بھیک مانگنا کوئی اچھی بات ہے۔ تمہارے ہاتھوں میں قوت ہے اور تم کام کر سکتی ہو۔ آوارہ پھرتے تمہیں شرم نہیں آتی ہے، تم چاہو تو کہیں نوکری دیکھ سکتی ہو۔ میں یہاں سے کل چلا جاؤں گا۔"

عورت نے اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی ایسی خاموشی دیکھ کر واگیش کڑک کر بولا۔ "کھڑی کیا ہو۔ سن لیا نا اب جاؤ۔ کام کرو۔" یہ کہہ کر اس نے اخبار کھولا اور عورت پھر سے جھاڑو دینے لگی۔ اس روز عورت نے گیارہ سیر آٹا پیسا۔ گھر کے کچھ کپڑے بھی دھوئے۔ جھاڑو دی اور چرخہ بھی کاتا۔ ان سب کاموں سے واگیش خوش ہونے کے بجائے ناراض ہوتا گیا۔ وہ عورت اسکے خیال کے مطابق فاحشہ، کام چور اور چرب زبان نکلتی تو اُسے اطمینان ہوتا۔ صبح کی اپنی بات چیت کے بعد اس کے دل میں کچھ رحم آیا تھا۔ سوچا تھا کہ دو ایک تسلی دلانے والی باتیں اس سے کرے گا لیکن دن کے وقت فرصت نہیں ملی اور شام کو آیا تو معلوم ہوا کہ عورت نے دن بھر مستعدی سے کام کیا ہے۔ بس یہی ایک بات اُسے بری سی معلوم ہوئی۔

واگیش نے اُسے بلا کر تاکید کی "سن لیا تم نے کہ میں کل جا رہا ہوں تمہیں کچھ چاہیئے تو کہو اور میرے دوست کا پیچھا چھوڑو۔ انھوں نے تمہارے کھانے

کپڑے کا کوئی ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ آج آٹا پیسا؟"

عورت چپ رہی۔

"سنتی ہو، پیسا کہ نہیں، کتنا پیسا؟"

آہستہ سے عورت نے کہا "دس سیر"

آٹا پورا گیارہ سیر تُلا تھا یہ بھابی سے واگیش کو معلوم ہو چکا تھا۔ بھابی جی ادھورا کام نہیں کرتی تھیں۔ ساڑھے گیارہ سیر ہو تب ہی ان کے ہاتھ کوئی چیز گیارہ سیر تل سکتی ہے لیکن اُس نے کہا دس سیر۔ یہ سن کر واگیش کو غصہ آگیا۔ اُس نے کہا "دس سیر! کل دس سیر! دن بھر کیا کرتی رہیں۔"

عورت کو خاموش دیکھ کر کچھ دیر بعد اُس نے پھر کہا "خیر یہ لو ــــ"

گیارہ پیسے مزدوری کے اس کی ہتھیلی میں رکھ دئیے۔ پوچھا "اور چرخہ کاتا تھا؟"

"اُس کی مزدوری کتنی ہوئی تبلاؤ! مجھے کل چلا جانا ہے۔"

عورت چپ رہی تو اس نے دھمکا کر کہا "تبلاتی کیوں نہیں ہو۔ غریب سے ہیں کوئی مفت محنت نہیں لے سکتا۔"

جب کافی دھمکایا گیا تو اس نے کہا "جو آپ مناسب سمجھیں۔"

واگیش نے چار آنے نکال کر دئیے بولا "یہ تو واجبی سے زیادہ ہی ہیں۔"

عورت نے اس پر ایک اکنی واپس لوٹاتے ہوئے کہا "تین آنے بہت ہیں۔"

واگیش کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ اس نے کہا "غریب کی محنت مفت کھانے والا اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اپنے پاس رکھو۔ اچھا دو دن تم نے یہاں کام کیا ہے۔ اس کا کیا ہوا؟"

عورت خاموش ہی رہی۔ واگیش نے زور سے کہا "بتاتی کیوں نہیں؟ کیا ہوا۔ جیسے بڑی رئیس زادی ہو؟"

عورت نے آہستہ سے کہا "مجھے یہاں کھانا کپڑا ۔۔۔۔۔۔"

واگیش نے ڈانٹ کر کہا "چپ رہو۔ کھانا یہاں مول نہیں بکتا۔ بس چپ۔ ٹھیک بتاؤ۔ دو دن کا تمہارا کیا ہوا؟"

وہ کچھ نہیں بولی۔ کچھ دیر گویا وہ بھی نہیں و پیش میں رہا۔ پھر اُس نے کہا "اچھا وہ چار آنے مجھے دے دو۔"

عورت نے پیسے واپس کر دیئے۔ واگیش نے ایک روپیہ نکال کر اسکے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا "بارہ آنے ٹھیک ہیں نا۔ اتنی مزدوری اور کسی کو نہیں ملتی۔ غریب جان کر تمہیں دے رہے ہیں۔"

اس کے بعد واگیش خاموش ہو گیا۔ اور عورت بھی خاموش کھڑی رہی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا "تمھارا نام کیا ہے؟"

"گیندو۔"

نام سن کر واگیش پھر خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا "ہاں تو تم اب چلی جاؤ کل مجھے جانا ہے۔ ان لوگوں پر بوجھ بن کر تمہیں نہیں رہنا چاہیئے۔"

اُسے خاموش دیکھ کر واگیش نے کہا "کیا کہتی ہو؟"

عورت نے جو کہا اس کا مطلب تھا "مجھے کل وہیں اسٹیشن لے جا کر چھوڑ دینا اکیلی میں راستہ نہیں جانتی۔"

"اسے کل اپنے ساتھ اسٹیشن لے جانا ہو گا" یہ بات تو واگیش کو بری

معلوم ہونے لگی۔

"اسٹیشن بھی کیا کوئی محلہ ہے! اسٹیشن پر گھومتی ہوئی یہ عورت زہر ہی تو پھیلائیگی اور کیا کرے گی"۔ اس قسم کے خیالات دل میں لاکر واگیش نے اُسے ڈانٹا سمجھایا اور نصیحت کی۔ یہ سب وہ عورت سنتی چلی گئی۔ آخر بہت پوچھنے پر اُس نے مُنہ کھولا تو پتہ چلا کہ انیس[19] روپیہ ایک قرضہ کے اُسے ادا کرنے ہیں اتنی رقم مل جائے تو وہ بھیک مانگنا چھوڑ سکتی ہے۔

واگیش کے جی میں تو آیا کہ کہہ دے "تم چاہے دوزخ میں جاؤ مجھے سے مطلب! بھیک مانگنا چھوڑو گی تو کسی پر احسان نہیں کروگی جو یہ انیس[19] روپیہ کی بات کہہ رہی ہو۔ کام کرو اور مہینے میں سے دھیلا دھیلا جوڑ کر قرضہ چکادو"۔

یہ سب کچھ سوچ کر بھی واگیش نے کہا کچھ نہیں۔

(۲)

الہ آباد میں "چھایا" رسالہ کے کاروبار میں۔ دوسرے روز گیارہ بجے واگیش اسکے دفتر میں بیٹھا تھا۔ اپنے نام کا کارڈ مینیجر صاحب کے نام بھیج چکا تھا اور یاد کیئے جانے کے انتظار میں تھا۔ کلرکوں کی قطاریں کام کر رہی تھیں اور گھڑی چل رہی تھی۔ سب اپنے اپنے کام میں محو تھے۔ واگیش سوچ رہا تھا کہ کب بلایا جائے گا۔

آخر اُس نے خیال کیا کہ کاروبار زیادہ ہیں فرصت کم ہے۔ دیر ہوتی ہی چاہیئے لیکن اب میں چلوں۔ پھر بھی صبر کرکے کچھ دیر بیٹھا ہی رہا۔ لیکن کام بڑا تھا مینیجر کی مشکل مینیجر ہی جان سکتا تھا۔ واگیش اس مشکل کو

نہ جان کر کرسی سے ٹیکا لئے کھڑا رہا اور آخر لوٹ چلا۔

اتنے میں اپنے کام سے نمٹ کر منیجر صاحب جلدی جلدی لوٹ رہے تھے۔ برآمدے میں ایک اجنبی کو دیکھ کر انھوں نے کہا۔ "آئیے!"

واگیش ٹھٹک گیا۔ "جی میں منیجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں"۔

"فرمائیے"۔

"میرے نام کا کارڈ آپ کو ملا ہوگا"۔

"آپ واگیش ہیں۔ آئیے آئیے" یہ کہتے ہوئے منیجر صاحب ہاتھ میں ہاتھ دے کر واگیش کو ساتھ لے چلے۔

واگیش اُن کے اجلاس کی کرسی پر بیٹھ رہا تھا کہ انھوں نے کہا "آؤ! یہاں نہیں۔ یہاں شور و غل زیادہ ہے۔ دفتر ہی تو ہے۔ آئیے اندر چلئے"۔

اس کے بعد وہ اُسے ڈرائینگ روم میں لے گئے۔ اور وہاں اُسکی خاطر تواضع کی کہنے لگے "ٹھیرے کہاں ہیں؟ یہ آپ ہی کا گھر تھا۔ کیا آ........وہ تانگہ آپ ہی کا ہے۔ ارے بھائی دیکھنا (انھوں نے گھنٹی بجائی اور چپراسی دوڑتا آیا) دیکھو۔ بابو صاحب کا تانگہ کھڑا ہے۔ حساب کر کے اُسے چلتا کردو۔ اوہ! نہیں نہیں۔ آپ رہنے دیجئے۔ کیا دینا ہوگا۔ ڈیڑھ گھنٹہ۔ تیرہ آنے — دیکھو تیرہ آنے چھوٹے بابو سے دلوادو اور سفر خرچ کے کھاتہ میں ڈال کر رسید یہاں لانے کیلئے کہہ دو۔ ہاں۔ یہ بتلائیے واگیش جی کہ آپ ہم سے خفا کیوں ہیں۔ اتنے خط لکھے ایک کا بھی جواب نہیں۔ ہم رسالہ کو اعلےٰ سے اعلیٰ معیار پر چلانا

چاہتے ہیں۔ بہت اونچا اسٹینڈرڈ (STANDARD) آپ جیسے حضرات کی مدد سے ہی یہ ہوسکتا ہے۔ لیکن آپ تو ایسے ناراض ہیں کہ خط کا جواب تک نہیں دیتے۔"

واگیش نے کہا "وہ واگیش اب ہے کہاں جو افسانے لکھتا تھا۔ وہ تو مر چکا۔ کیا آپ لوگ چاہتے تھے کہ وہ نہ مرتا یا اب چاہتے ہیں کہ نہ مرے!"

"واہ واہ یہ آپ کیا کہتے ہیں۔ ارشاد فرمائیے۔ ہم حاضر ہیں۔ کاروبار کی حالت تو آپ جانتے ہیں۔ کاغذ کی مہنگائی تو کمر توڑے ڈالتی ہے۔ پھر بھی حسب لائق ہیں ہم پیچھے نہ ہٹیں گے۔ آپ جو کہیئے سر آنکھوں پر۔ دس پندرہ بیس چالیس۔ آپ کہہ کر تو دیکھیئے لیکن ہم ہر مہینہ آپ سے ایک افسانہ چاہتے ہیں۔ اپنے یہاں افسانہ نگار ہیں کتنے! ہیں کہاں۔ ولایت میں دیکھیئے۔ وہاں لوگ ہیں اونچے درجہ کے اور اُن کی قدر بھی ہے۔ مگر یہاں آپ ہیں اور دو چار اور گن لیجئے۔ اگر یہ لوگ بھی لکھیں نہیں تو کیا کوڑے کرکٹ سے اپنا رسالہ بھریں۔ آخر آپ ہی کہیئے۔ دیکھئے واگیش جی ایک افسانہ آپ ہمکو ہر مہینہ ضرور دیجئے۔ اور رقم جو ارشاد فرمائیے حاضر کروں۔ سچ کہتا ہوں۔ میرا منشا یہ ہے کہ رسالہ کا اور اس کے ذریعہ ہندی کا درجہ اونچا ہو۔ ولایت کے کسی رسالہ سے آپ کا یہ رسالہ ٹکر لے سکے۔ جی ہاں۔ اور آپ لوگوں کی عنایت ہو تو یہ کیا کچھ مشکل ہے.......!"

واگیش اپنے میں سوچ رہا تھا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ بیس روپیہ کی غرض لے کر وہ یہاں آیا تھا۔ کانپور سے چلا تو دس روپیہ اس کی جیب میں تھے۔ کیا معلوم تھا کہ راستہ میں بلا گلے پڑے گی۔ اب بیس روپیہ یہاں سے لیکر

اس عورت کے سر پر پٹک دیگا اور چھٹکارا پائے گا۔ یہی سوچ کر وہ آیا تھا۔
یہاں آنے پر خیال ہوا کہ کہاں میری لاپرواہی کہ اتنے خطوں کا ایک جواب بھی
نہیں دیا اور کہاں اُن کی یہ خاطر تواضع۔ اُس نے کہا "جی نہیں۔ وہ تو
آپ کی نوازش ہے لیکن میں افسانہ لکھنا بھول گیا۔ کس منہ سے آپ کو امید
دلاتا اور امید سے بھرا ہوا خط نہ بھیج سکوں تو سوچا کہ اس سے تو شرم
رکھنے کے لئے جواب ٹال دینا ہی بہتر ہے۔ خط نہ لکھنے کے قصور کی وجہ
یقین مانئے یہی شرم ہے۔"

"واہ واہ۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں! آپ جو لکھیں گے ایک چیز ہوگی۔
کہئے کیا منگواؤں پیشگی رکھیئے۔ بعد میں جب ہو سکے لکھتے رہیئے گا۔ سب
آپ ہی کا ہے۔ بولئے فرمائیے! مگر ایک افسانہ ہر نمبر میں آپ کا ہو۔
جب ہی تو بات ہے!"

واگیش نے کہا "بیس روپیہ"

"بس! تو وہ یہ لیجئے۔ دیکھئے ہر مہینے ایک عمدہ افسانہ ہم کو دیجئے۔ اور
رسالہ کو اپنا سمجھئے" (چپراسی آتا ہے) دیکھو! پچاس روپیہ لانے کو کہو۔
اور رسید بھی بنا لاویں"۔ "ہاں واگیش جی! آپ کا سامان یہاں کیوں نہ
منگوا لوں۔ ایک مرتبہ غریب کا بھی گھر سہی۔ موٹر میں دس منٹ میں
آجائیے گا۔"

واگیش نے معافی مانگی اور شکریہ ادا کیا۔

روپیے اور رسید لے کر بابو آیا تو واگیش نے کہا "دیکھئے میں کچھ عرصہ سے
لکھ نہیں رہا ہوں۔ لکھا ہی نہیں جاتا۔ اس لئے یقین کے ساتھ یہ نہیں

کہہ سکتا کہ آپ کو افسانہ کب مل جائے گا۔ دو تین مہینے بھی ہو سکتے ہیں"
"تین مہینے۔ بہت ہیں۔ تین سہی لیکن چوتھے مہینے تو میں امید کروں"۔
"جی ہاں۔ چوتھے مہینے افسانہ نہ ملنے کی تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔
یقین مانئے ایک مدت سے مشق چھوٹ گئی ہے۔"

"واہ واہ - یہ بھی آپ کیا کہتے ہیں۔ آپ کا قلم کیا مشق کا محتاج ہے
آپ کے قلم اُٹھانے کی دیر ہے۔ پھر کیا ہے!"

روپیے مل گئے۔ ایک آنہ کے اسٹامپ پر رسید لکھ دی گئی مینیجر نے
کہا "کیا آپ جائیں گے۔ جی نہیں۔ ابھی نہیں۔ کسی حالت میں ابھی آپ
نہیں جا سکتے۔ ہاں رہائی ہوگی تو ایک شرط پر اور وہ یہ کہ آپ آئندہ سے
یہاں ٹھہریں گے"۔

واگیش نے اس وقت کیلئے تو مجبوری ظاہر کی۔ ہاں۔ آئندہ وہ
یہاں آئے گا۔ ابھی تو ایک دوست کے یہاں پہونچنا ہے۔ اس پر مینیجر
بہت مایوس تھے پھر بھی انہوں نے ڈرائیور سے موٹر لانے کو کہا۔

جہاں پہونچنا ہو موٹر انھیں پہونچا دے گی۔ مینیجر واگیش کے ساتھ موٹر تک
آئے ڈرائیور سے کہا "بابو جہاں کہیں لے جاؤ"۔ گھڑی میں وقت دیکھ کر
واگیش سے کہا "آپ کو وہاں سے پھر کہیں جانے کیلئے تو موٹر کی ضرورت
نہیں ہوگی۔ دو بجے ہیں۔ پونے تین بجے مجھے ایک صاحب سے ملاقات
کرنے کیلئے جانا ہے"۔

واگیش نے بہت بہت شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "جی نہیں۔ مجھے گھر
پہونچا کر گاڑی واپس آسکتی ہے" (ڈرائیور سے) "اچھا تو بابو کو پہنچا کر سیدھے یہاں

گاڑی لے آنا۔ اچھا واگیش جی۔ دیکھیئے مہربانی رکھیئے۔ اور خادم کو یاد فرمائیے گا۔"

اسی دن رات کی گاڑی سے واگیش کو جانا تھا۔ اس نے دوست سے پوچھا کہ انہیں نوکر کی ضرورت تو نہیں۔ ہاں دوست کو ضرورت نہیں تھی اگر واگیش کہے اور اس عورت کا کوئی اور ٹھکانہ ہو تو وہ اُسے کچھ مہینے نبا ہنے کو تیار تھے۔ اس عرصہ میں کہیں دوسری جگہ اس کیلئے دیکھ لی جائے گی واگیش نے اس عورت سے دریافت کیا معلوم ہوا کہ واگیش اُسے خود وہیں سٹیشن کے پاس چھوڑ آئے۔ اسکے بعد وہ اور کچھ نہیں چاہتی۔ واگیش نے سمجھایا کہ یہاں آرام سے رہوگی۔ اور دس روپیہ کے حساب سے دو مہینے میں بیس روپیہ جمع ہو جائیں گے۔ مگر نہیں وہ واگیش کے ساتھ اسٹیشن جائے گی۔

واگیش کو بُرا معلوم ہوا لیکن اسکے دوست کو یہ بات بہت پسند آئی۔ عورت ذات کا انہیں بھروسہ نہیں۔ پھر جس نے کھلی ہوا میں سانس لیا ہو۔

اس روز سویرے ہی اُٹھ کر اس عورت نے دس سیر آٹا پیسا۔ جھاڑو دی مہری نہ آنے کی وجہ سے ناشتہ بنائی۔ اور برتن بھی اس نے صاف کیئے۔ اس کام کی مزدوری واگیش نے آٹھ آنے دے کر حساب چکتا کر دیا۔

آج اس عورت نے اپنے پُرانے کپڑوں کے بارے میں پوچھا۔ وہ ان کپڑوں کو وہیں اتار جائے گی۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ اس کے کپڑے نہیں ہیں تو یہ سن کر مکان کی مالکہ کے کمرے کی دہلیز پر اپنا سر جھکاتے وقت اس نے اپنی گانٹھ سے کل پونے دو روپیہ نکال کر رکھ دیئے۔ یہ دیکھ کر مکان کی مالکہ آگ بگولہ ہو گئی۔ غصہ کی حالت میں وہ اپنی جگہ سے

اٹھی اور لات مار کر سارے پیسے بٹور دیے۔ ساتھ ہی اُسے فوراً گھر سے نکل جانے کو کہا۔ عورت اسکے سامنے سے دُور ہو گئی لیکن اسکے بعد بھی وہ طرح طرح کی گالیاں زبان پر لا کر بڑبڑاتی رہی۔ وہ عورت کچھ کہے بغیر بکھرے ہوئے پیسے جمع کر کے کسی کام میں لگ گئی۔

خیر —— واگیش اسے ٹانگہ میں بٹھا کر چلا اور راستہ میں بیس روپئے اُسے سونپ دیئے۔ روپیہ دے کر اس نے بہت سخت سست بھی کہا عورت نے روپئے لے لئے اور خاموش ہو رہی ہے۔ واگیش نے کہا — تمکو شرم آنی چاہیئے کہ ایک عزت کی نوکری مل رہی تھی جو تم کو پسند نہ آئی میں جانتا ہوں تم پھر اسی طرح ہاتھ پھیلاتی رہوگی۔ اور اگر تم میں کچھ بھی شرافت ہوگی تو بیس روپیہ جو تم کو دیئے ہیں اسکے بعد کچھ کام دھندے سے لگ جاؤگی۔ یہ نہیں کہ بے حیائی کا جامہ پہن کر نیک آدمیوں کو پریشان کرتی رہو۔ ایک شریف آدمی نے تمہیں اس عزت سے رکھا۔ کھانے اور پہننے کو دیا۔ اور پھر میری خاطر دس روپیہ ماہوار دینے کو تیار ہوئے۔ اور تم ایسی کہ ان کے ایک بھی احسان کو نہیں گنا۔ تمہیں کام کرتی دیکھ کر میں سمجھتا تھا کہ تم میں سمجھ ہوگی۔ جانے دو۔

"یہاں رہتی کہاں ہو؟"

"کہیں نہیں"

"کہیں تو رہتی ہو؟"

"کہیں رہ لیتی ہوں"

سچ پوچھو تو واگیش کو بہت بُرا معلوم ہوا۔ وہ جلد ہی اس بلا سے

چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔ اُسے خیال ہوا کہ اسٹیشن پر قلی اور دوسرے لوگ کیا سمجھیں گے۔ یہ خیال اسکے دل میں اسوقت تک نہیں آیا تھا۔ اب جو آیا تو سچ مچ یہ سب بڑا ہی بے تکا معلوم ہوا۔ اور شرم آنے لگی۔ وہ گم سم ہو گیا۔ گویا وہ اصل بات کو یہیں ختم ہوتی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ اسی طرح خاموش تھا عورت نے دریافت کیا" آپ کہاں جائیں گے بابو صاحب"؟

"کانپور"

جواب میں ایک لفظ جھٹکے سے ادا کر کے وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ ٹانگہ میں وہ ٹانگہ والے کے برابر آگے بیٹھا تھا۔ بچے کو لیکر عورت پیچھے بیٹھی تھی۔ واگیش دل کو سمجھا رہا تھا کہ ٹانگہ والا جانتا ہے کہ یہ عورت میرے ساتھ نہیں ہے۔ ٹانگہ والے نے ان کی باتیں سن لیں ہونگی۔ ٹانگہ والے کی موجودگی میں کوئی بات زور سے کہی بھی نہیں جا سکتی تھی۔

کچھ دیر بعد عورت نے پوچھا" وہیں رہتے ہیں"؟

غصہ میں واگیش نے انتہائی سخت لہجہ میں کہا" ہاں"۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد عورت نے کہا" کانپور تو بہت بڑا ہے۔ وہاں کہاں رہتے ہیں"؟

واگیش نے تنگ آکر کہا" تم چپ نہیں رہ سکتی ہو"۔

عورت خاموش ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے کچھ نہیں کہا۔ اسٹیشن پہونچ کر جلدی سے واگیش نے قلی کو آواز دی۔ اس کے سر پر سامان رکھا اور چلنے ہی کو تھا کہ قلی نے پوچھا" بابو۔ سب سامان ہو گیا"۔

واگیش کو اس وقت یاد آیا" ٹانگہ کے قریب نیچے سوٹ کیس ہے" قلی ٹانگہ کے

پیچھے آکر بولا" اترو بہوجی"۔

عورت اس وقت تک اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ سن کر ایک دم چونکی۔ اور جھٹ جھٹ تانگہ سے اتر گئی۔ قلی نے کہا۔ تیسرا درجہ بابوجی۔ بہوجی پلیٹ فارم پر چلتی ہیں۔ آپ ٹکٹ لائیے۔

واگیش نے روکھے منہ سے کہا" ٹکٹ ہے"؟

عورت بسرائی کھڑی تھی۔ واگیش نے جھلا کر کہا" کیا کھڑی ہو۔ چلو۔ قلی کے ساتھ چلو"۔

کچھ دیر ٹھٹک کر عورت قلی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اتنے میں واگیش کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ پیچھے مڑ کر کیا دیکھتا ہے کہ ہنس رہے ہیں بابو رام کشور ——

"چلو واگیش کا بیو چل رہے ہو۔ میں بھی چل رہا ہوں۔ یہ کون ہیں"۔

واگیش نے کہا" کون!"

رام کشور نے کہا" یہی جو ساتھ ہیں"۔

"ساتھ کون۔ کوئی نہیں"۔

"اچھا کوئی نہ سہی"۔ یہ کہہ کر رام کشور مسکرا دیئے۔ واگیش کسی طرح رام کشور سے آنکھ بچا کر تیر کی طرح پلیٹ فارم کی طرف بڑھ گیا۔ ریل ابھی آئی نہ تھی قلی کے ہٹ جانے کے بعد اس نے عورت سے کہا" دیکھو تم نے مجھے کیسے جھمیلے میں ڈال دیا ہے اب تم جاؤ"۔

عورت ایک طرف گردن جھکائے کھڑی تھی۔ وہیں کھڑی رہی۔

"جاؤ"۔

"چلی جاؤنگی"۔

"کب چلی جاؤ گی۔ اب جاؤ"۔

"آپ چلے جائیں گے تب میں بھی چلی جاؤنگی"۔

"اس وقت کیوں۔ ابھی جاؤ"۔

یہ سن کر نہیں کہہ سکتے کہ کیا ہوا۔ عورت ایکدم بدلی ہوئی سی دکھادی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کا میں کیا بگاڑ رہی ہوں۔ کہہ تو دیا کہ چلی جاؤں گی۔ پلیٹ فارم سبھی کیلئے ہے"۔

گنیش داس کی چھاتی پر کسی نے مکا مار دیا۔ وہ سکتہ میں رہ گیا۔ بولا "کیا مطلب؟"۔ عورت نے اور بھی مسکراتے ہوئے کہا "کہہ تو دیا کہ پلیٹ فارم سبھی کیلئے ہے"۔ گنیش داس اس منہ پھٹ عورت کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہ گیا۔ "تو تم نہیں جاؤ گی؟"۔ مسکراتی ہوئی وہ بولی "— نہ، نہیں جاؤں گی"۔

گنیش داس کچھ دیر کھویا رہا۔ پھر اُس نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "اچھی بات ہے۔ تو تمہیں کھڑی دیکھ کر لوگ کیا سمجھیں گے۔ سامان پر بیٹھ کیوں نہ جاؤ"۔

یہ سنتے ہی وہ بستر بند پر بیٹھ گئی اور چمڑے کا سوٹ کیس الگ سرکا کر بولی "آپ بھی بیٹھ جائیے"۔

گنیش داس بھی بیٹھ گیا۔ پھر عورت نے کہا "مجھے اسٹیشن پر چھوڑ کر جاتے ہو۔ تمہیں کچھ خیال نہیں آتا؟ تمہیں کسی بھی ملازمہ وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے بس کھانے کپڑے پر میں پڑی رہ سکتی ہوں۔ میں ہمیں لیتی ہو۔

جھاڑو دے سکتی ہوں ۔ اور کھائی پکائی کر لیتی ہوں ۔ کپڑے بھی دھوتی ہوں ۔ آپکو کسی خادمہ کی ضرورت نہیں ہے" ۔ —————— ؟

واگیش نے اس کی طرف دیکھا اور سخت لہجہ میں کہا" نہیں مجھے ضرورت نہیں ۔ میں امیر نہیں ہوں" ۔

"میں کچھ نہیں مانگتی ۔ روکھے سوکھے میں رہ لونگی ۔ تم سمجھ دار ہو کر اسٹیشن پر مجھے کہاں چھوڑ جارہے ہو" ۔

واگیش کو بہت بُرا معلوم ہوا ۔ اُس نے کہا" مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایسی ہوگی ۔ تم کیا چاہتی ہو ۔ یہ لو میرے پاس بیس ہی روپیہ اور ہیں ۔ یہ لے کر کوئی محنت مزدوری دیکھو" ۔

عورت نے چپ چاپ روپیے لے لئے کچھ نہیں کہا ۔ بس واگیش کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی ۔

اس کے بعد بات چیت کا موقع نہیں ملا ۔ سامان اٹھانے کیلئے قلی آپہونچا ۔ ریل آتی دیکھ کر عورت جھٹ سے بستر سے الگ کھڑی ہوگئی ۔ ریل آئی قلی سامان لے کر تیسرے درجہ کی طرف بڑھا ۔ واگیش بھی جگہ کی جلدی میں اس طرف بڑھ گیا ۔ عورت اپنی جگہ سے ہلی نہ ٹلی ۔ وہیں رہ گئی ۔

چلتی ہوئی ریل سے واگیش نے دیکھا کہ عورت جاتی ہوئی گاڑی کیطرف مُنہ کئے وہیں کی وہیں کھڑی تھی ۔

(۴)

واگیش کو یہ کیا ہوا ۔ اس کی حالت بدلنے لگی ۔ لکھنا کم ہو گیا ۔ تفریح کم ہوگئی ۔ لوگوں سے ملنے کی خواہش نہ رہی ۔ جیسے نامعلوم

طریقے اندر ہی اندر اُسے کچھ کترنے لگا ہو۔ گھر میں ہوتے ہوئے بھی وہ تنہائی محسوس کرنے لگا۔

اصل بات یہ ہے کہ اس وقت تک وہ ان سوالوں سے کھیلتا آیا تھا سمجھتا تھا کہ یہی ان کا حل ہے۔ وہ آزاد تھا اور کسی باطنی احساس کا قائل نہیں تھا۔

سب ٹھیک ہے کیوں کہ سب غلط ہے۔ اس لئے زندگی کو سطحی نظر سے دیکھنے کا عادی بن گیا تھا۔ عقیدت مند لوگ اس کے مذاق کا موضوع بن رہے تھے۔ اور وہ انھیں یہی خیال کر رہا تھا۔ اسی وجہ ایک ادیب کی حیثیت سے وہ بہت مشہور تھا۔ ایک کی عقیدت مندی دوسرے کی ہنسی کا موضوع بنے۔ اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہے۔ اس طرح دنیا کے سارے عقیدت مندوں کو جاہل اور سارے ماننے والوں کو بے وقوف بنا کر وہ اکثر لوگوں کے دلوں کو خوش کرتا تھا۔ یوں ظاہری طور پر وہ دنیا کی بہت تعریف کرتا تھا۔ کیوں کہ عقیدت کو توڑنا تھا۔ لیکن اب کی دفعہ الٰہ آباد سے لوٹ کر وہ خود چکر میں آگیا تھا۔ اس وقت اس کی تحریر میں ہنسی اور مذاق کے داخل کرنے اور اخلاق کو بداخلاقی کا روپ دینے میں کچھ دقّت نہیں تھی۔ کام دلچسپ تھا۔ شہرت خاصی ہوتی تھی۔ شہرت کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی ملتا تھا۔ پیسہ ——
اُنھوں! پیسہ کی خواہش کو اتنی ضرورت نہیں تھی اور یہ پیسہ کو خواہش کی اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے۔ بس یہ حال تھا۔ لینے والا ہاتھ خالی رہے اتنی دیر میں دینے والے ہاتھ کو بھی کچھ آرام مل جاتا تھا لیکن ادھر سے آیا

نہیں کہ ادھر گیا نہیں جس کی یہ حالت ہو وہ بیچارہ پیسہ سے کیا محبت کر سکتا تھا۔ مجبوری لت ہے اور لت لاچاری ہوتی ہے۔ مگر دوستوں میں بیٹھ کر شراب چکھ گیا۔ اور رنگینیوں میں کسی رنگین مزاج ساتھی کا ساتھ نباہ دیا۔ یہ دوسری بات ہے۔ ایک تو یہ معمولی بات ہے۔ نہیں تو دھرم کا خاتمہ ہو جائے۔ البتہ بگاڑنے والے راستہ پر پڑے ہوئے ہیں۔ بگڑتے ہوئے دوست کے ساتھ وہ چند قدم چل لیتا تھا اسے وہ اپنا فرض سمجھتا تھا لیکن اس میں خود بگڑنے کی طاقت نہ تھی۔ وہ کچھ بنا ہی ایسا تھا کہ ایسے چند ہی لمحے اس پر سے گذر جاتے اور وہ ان پر سے گذر جاتا۔ دونوں ایک دوسرے کو چھوتے یا ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہیں ہوتے تھے۔ جو ہوا۔ ہوا۔ اس کا ذکر کیا۔ یہاں تک کہ یاد تصور اور گذری ہوئی باتیں بھی اس کی سمجھ میں نہ آئیں۔

مگر الٰہ آباد سے واپس آکر یہ اُسے کیا ہو گیا؟ دنیا کو اب تک مزے سے دیکھتا تھا۔ اور اس میں مزے سے رہتا تھا۔ دنیا تماشہ نہیں تو کیا ہے۔ قسم قسم کے پھول سامان ساڑیاں اور طرح طرح کی بہاریں چمن کو یہاں گلزار بنا رہی ہیں۔ ان سب میں اطمینان سے وہ کیوں نہ گھومتا رہے۔ کوئی اسے کیوں پھانسے — کوئی نیک یا بد — با اخلاق یا بد کردار۔ احسان مندی اور احسان فراموشی یہ سب موجود ہیں۔ اور یہ چکر چل رہا ہے۔ کدھر چل رہا ہے کسی نامعلوم مقام کی طرف۔ آخر میں تو سب کو مرنا ہے بس ہو گیا طے کہ مرنا ہے۔ اب اس موت میں کوئی کیوں دیکھے! انجام کی تہہ میں یا اسکے پار کچھ دکھ تو نہیں سکتا۔ اس لئے

ادھر دیکھنا ہی سب سے بڑی حماقت ہے۔ یہی سوچ کر وہ خوشی سے زندگی کے ان لمحات میں تیرتا جا رہا تھا۔

جب الہ آباد سے لوٹ کر آیا تو کچھ ہی دنوں میں معلوم ہونے لگا کہ اسے شراب کی ضرورت ہے۔ اندر کچھ پھوٹنا چاہتا ہے جسے ڈوبانا چاہیئے غم نہیں تھا جسے غلط کرنا ہے۔ پھر بھی کچھ تھا جو محسوس ہو کر بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اب تک اسے اپنی خودی کا پاس تھا۔ لیکن اب ضرورت ہوئی کہ وہ خودی کو بھلا دے۔ یعنی وہ موہوم شئے اس میں پیدا ہو چلی تھی جس کا نام "خودداری" ہے اور جو زندگی ہے۔ اسی کا دوسرا نام ہے "روحانی تسکین"۔

اس سے بڑھ کر تعجب کیا ہے کہ "انسان کو روح ملے۔ ماں بچہ کو پیدا کرتی ہے تو ہر بار اس کی نئی زندگی ہوتی ہے۔ ہستی کو اپنی روح ملتی ہے تو بھی نئی زندگی کے بغیر نہیں۔ پیدا ہونے کے لئے ہی مرنا پڑتا ہے" کچھ ایسا ہی گنیش واڈیسا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ وہ اپنے اندر کسی کا وجود نہیں چاہتا تھا لیکن اس پر بھی ایک بیج اس میں داخل ہو گیا تھا۔ اس لئے اُسے اپنے وجود کے باوجود مرنا پڑ رہا تھا۔ مگر مرضی کے مطابق مرنے کا ہنر کس کو آتا ہے۔ اس لئے جس شئے کو پیدا کرنا ہے اس کو اس میں مٹنا چاہیئے گنیش واڈیسا اس سے چمٹا رہنا چاہتا تھا۔ اس کشمکش میں اس کا دماغ معطل سا ہو گیا تھا۔

لکھنا بھاڑ میں چلا گیا۔ شہرت کا خیال اور روزمرہ فرائض کی فکر چولھے میں گئی۔ بس اس کی شراب کی مقدار بڑھتی جا رہی تھی۔ اس

ڈھنگ سے حال بگڑتا ہی گیا۔ پیسے کی کمی ہوئی۔ مگر مفلس رہنے کی اُسے عادت نہ تھی نہ اس میں بے ایمانی کا کوئی شائبہ تھا۔ آخر یہ ہوا کہ وہ ہر کسی سے ادھار لے لینے لگا۔ لیا اُدھار۔ لوٹانے کی اسے یاد نہ رہتی تھی۔ ایسے لگ بھگ ایک سال ہو گیا۔

اس عرصہ میں "چھایا" کے منیجر کے کئی خط آئے۔ خط ملنے پر وہ ہنس دیتا تھا — رفتہ رفتہ خطوں میں منت سماجت کی جگہ تقاضے ہونے لگے۔ پھر بھی اس نے جواب نہیں دیا۔ تقاضہ میں ایک مرتبہ اسے کچھ بھروسے سے گری ہوئی بات دکھائی دی۔ اس نے منیجر کو لکھا کہ چالیس روپے۔ کیا ہی آپ نے تماشے پر اتنا خرچ نہیں کیا۔ سمجھیے — یہ چالیس بس تماشہ میں گئے۔ اور تماشہ کو تماشہ کی طرح آپ دیکھیں تو جتنا وہ برا ہو اتنا ہی اچھا کہا جا سکتا ہے۔ اب آپ افسانہ مجھ سے نہ مانگیں۔ نہ روپے۔ روپے ڈوب گئے اور افسانہ لکھنے والا بھی ڈوب گیا۔ خط لکھ کر واگیش نے سوچا ہوگا کہ چھٹی ہوئی۔ لیکن منیجر کی شرافت ختم ہونے والی تھی۔ خط آیا کہ آپ کے افسانے خط کی زینت اور زیادہ بڑھتی ہے۔ روپیہ کی کوئی بات نہیں بیس روپے اور بھیجے جاتے ہیں۔ افسانہ آپ سے لے اس کا ادبی دنیا کو انتظار رہے۔ خط پڑھ کر واگیش نے اُسی وقت کارڈ پھاڑ پھینکا۔ اور منی آرڈر لانیوالے ڈاکیہ کو دھکا کر گھر سے باہر نکال دیا۔

ایسے کچھ دن اور بیتے۔ واگیش راہ پر نہ آیا۔ اسے خوفناک جنگ کرنی پڑ رہی تھی۔ شراب کی کافی مقدار بڑھ گئی تھی۔ اور اب سستے قسم کی شراب مل رہی تھی۔ اسی اثناء میں اس نے گاندھی درشن پڑھ ڈالا۔

مضمون لکھ کر اخباروں میں بھیجے۔ جن کی ادبی حلقوں میں تعریف ہوئی۔ اسکے موضوع پر اور کئی لوگوں نے تعریفی مضمون لکھے۔ تعریف کے سارے خطوط پُرزے پُرزے کر کے اس نے باہر پھینک دئیے۔ وہ جب شراب سے خالی ہوتا تو کمرہ میں گاندھی جی کی تصویر لگا کر اس کیطرف دیکھتا رہتا۔ تصویر دیکھتے دیکھتے رونے لگتا اور پھر بوتل کا کارک اڑا کر پینا شروع کر دیتا۔

ایسے وقت میں "چھایا" کا خط آیا کہ اب بہت ہوا۔ افسانہ بھیجئے یا روپئے واپس لوٹا دیجئے۔ افسانہ کے نام پر وہ جل بجھ گیا۔ کلیجہ میں آگ لگ رہی ہو مگر اس کا افسانہ بھی ہو سکتا ہے۔ شہر میں آگ لگتی ہے اور اخباروں کے رپورٹروں کیلئے افسانہ بن جاتی ہے۔ اخباری رپورٹروں کا افسانہ دینے کا کام آگ میں جلنے والوں کے جلنے کے کام سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ سچ ہو سکتا ہے لیکن جو خود جل رہا ہو وہی اس جلن کی لذت کا اظہار کیسے کرے۔ جوالہ مکھی اپنی تصویر دیکھ کر کیا کہے گی۔ اس تصویر کی اتنی ہی قیمت ہے کہ وہ ڈرائینگ روم کی آرائش بڑھائے۔ اور اگر کہیں اپنی ہی اصلیت کے قریب پہونچنے کی ہمت کرے تو وہ تصویر قریب تک پہونچ نہیں سکے گی۔ بیچ ہی میں پھینک جائے گی۔

اس لئے "چھایا" کے افسانہ کے تقاضہ پر وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ اس کو ایسا غصہ آیا کہ وہ اپنے ہی کو نہ کاٹ لے۔ سوچا کہ لکھ دے۔ اگر چالیس روپیہ کے بغیر کسی کی جان نکل رہی ہو تو تار دینا۔ اس وقت روپیے فوراً یہاں سے آئیں گے۔ مگر اس نے یہ نہیں لکھا۔ کیونکہ اس کو ایکدم خیال ہوا کہ چالیس روپیہ کے بغیر یا اسکے عوض کے بغیر واقعی منیجر کی جان نکل رہی ہے

وہ چاہتا تھا کہ اس کی جان ضرور بچے۔ اس لئے کہ وہ جان ضرور پیسے کی امید میں اٹکی ہے۔ وائیش آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سر کے اوپر لگی ہوئی گاندھی کی تصویر اور اسکے آگے چھت میں دیکھ رہا تھا کہ کہیں سے چالیس روپئے نکل آئیں وہ جلدی سے اتنے روپئے "چھایا" کو بھیج دینا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے کسی کی جان بچانے کا سوال تھا۔ ایسی حالت اور چالیس روپے........!

"حرام کا نہیں۔ بلکہ کام کا کھانا چاہیئے" میں کس کام کا کھا رہا ہوں۔ کس کام کا کھاتا رہا۔ کیا تصنیف و تالیف کام ہے۔ شہرت کام ہے.....

اصل میں وہ جہاں تھا اسی زمین پر ڈگمگا رہا تھا۔ پیر لڑکھڑا گئے تھے۔ وہ گر پڑ رہا تھا سنبھل کر ہر دفعہ وہ وہیں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ مگر زمین نیچے سے برابر کھسک رہی تھی۔ اس کیلئے اس پر مضبوطی سے پیر جما کر کھڑا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ اس کو تو گرنا ہی تھا لیکن گر کر سنبھلنا کہاں ہوگا — یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ گاندھی ہی ایک آدمی ہے جو اس اصلی زمین پر کھڑا ہے لیکن میرے پیر تو اس زمین کو چھو بھی نہیں سکتے۔ میں کہاں ٹھہر جاؤں۔ اس طرح اپنی زمین سے اکھڑ کر وہ گویا پاتال میں گرتا جا رہا تھا........ حرام - کام - کام - حرام — وہ حرامی ہے۔ حرامی ہے۔ حرامی ہے --

پھر اسے وہ عورت یاد آئی جس کو حرام کا نہیں کام کا محنت کی تعلیم اس نے دی تھی۔ اس نے جی توڑ کر کام کیا تھا۔ پھر بھی وائیش نے اسے حرام کا نہیں کام کا کھانے کی تعلیم دی تھی۔ کہا تھا "آوارہ نہ رہنا۔ کام کرنا" —

لیکن واگیش خود کیا کر رہا تھا۔ اس نے کیا آوارہ چن ہی کو ایک فن کا روپ نہیں دے لیا تھا۔ کیا اس نے اپنی جانب سے اس میں فریب کا اور اضافہ نہیں کیا تھا۔ اس طرح اس کی شہرت اور اس کی بڑھائی ایک بہت بڑے دھوکے کا جال نہیں تھی؟ اگر اس عورت کا ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنا جھوٹ تھا تو کیا اس کا کتابیں کالی کر کے پیٹ بھرنے اور تعلیم دینے کا دم بھرنے کا دھندا سفید جھوٹ نہیں تھا؟

لیکن اس فکر کی گہرائی میں اُسے نہ کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ اس پر وہ گاندھی کی تصویر کو دیکھ کر رو رہا تھا اور پھر تو ل سنبھال لیا تھا۔ کچھ دن اور نہ گذرے تھے کہ "چھایا" کا نوٹس آیا کہ چالیس روپئے سات روز کے اندر اندر بھیج دو نہیں تو معاملہ وکیل کے سپرد کر دیا جائے گا۔ نوٹس پڑھ کر واگیش نے چین کا سانس لیا۔ وہ خوش ہوا کہ کسی کے مرنے کی بات اب نہیں ہے، عدالت اس کو اب چلالے گی۔ اس لئے نوٹس ملنے پر وہ اس بارے میں بے فکر ہو گیا۔ اب رحم کا سوال نہ تھا۔ جس کو عدالت کا زور حاصل ہے اس پر رحم کرنا اس کی بے عزتی کرنا ہے اور واگیش کتنا ہی گر جائے لیکن اتنا بے ایمان نہ ہو سکتا تھا کہ دینے والے پر رحم نہ کرے۔ مگر دینے والے کی ہتک کرے یہ ضرور تھا۔

(۵)

لیکن ہائے۔ واگیش جرمانہ کی وجہ سے مطمئن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی خوب فضیحت ہو۔ اس نے جو ادب اور شہرت کا سفید جھوٹ اپنے چاروں طرف پھیلا دیا تھا وہ جھوٹ ٹوٹ کر خاک میں ملجائے اسکی

عزت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کیچڑ میں دب جائے - وہ جیل کی سزا پائے - اسکی سخت سے سخت بے عزتی ہو - اسے روزمرہ کے فرائض سب فضول معلوم ہو رہے تھے اور اپنے کو سزا دینے کا خیال اُسے ستا رہا تھا -

اس وقت اس کی حالت یہ تھی کہ اگر سو روپیہ زبردستی کوئی اس کے ہاتھ میں دے جاتا تو وہ سو کے سو کسی راہ چلتے اندھے کو دے دیتا مگر وہ "چھاپا" کو ایک پائی ادا نہ کر کے اس کی طرف سے وہ بے عزت ہی ہونا چاہتا تھا - اس سے سستی شے پا کر کسی طرح بھی چھوٹ رہنا نہیں چاہتا تھا - دنیا جب تک اسے پامال نہ دیکھ لے اور مجرم نہ مان لے اس وقت تک اسے اطمینان نہ ہو گا کیونکہ غرور کا گناہ کرنے والا اس سے کم سزا کا مستحق نہیں ہے - واگیش تو ادیب - تو عالم - تو زندگی کے اخلاق سکھانے والا - ارے بیوقوف ! اب تو ہی دیکھتے ہوئے جہنم میں پڑ جا ! -

اس قسم کی اس کی خواہشات تھیں اور وہ گاندھی کی طرف دیکھتا رہتا اور شراب پی کر ہنستا تھا -

مگر اس کی مرضی کے موافق کچھ نہ ہوا - کیوں کہ ایک دن وہ الہ آباد والی عورت آئی اور اس نے چالیس روپیہ واگیش کو لوٹا دیے - واگیش نے اسے ڈانٹا ڈپٹا - گالیاں دیں - نوٹوں کو پھاڑ دینے کی دھمکی دی لیکن یہ سب کچھ وہ پی گئی - وہ نہ وہاں سے لوٹی اور نہ اس نے روپئے واپس لئے -

واگیش نے کہا "تم اندھی تو نہیں ہو - میں نے تمہیں کب روپئے دیئے - کیسے روپیے - وہ کوئی اور ہو گا - دیکھتی نہیں ہو - یہ کیسی جگہ ہے

اس لئے میرے ہوش میں رہتے ہوئے تم یہاں سے چلی جاؤ"۔ مگر عورت نے کچھ نہیں سنا اور روپیہ ڈال کر وہ اس کمرے کی ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزوں کو سنبھالنے لگی۔

واگیش سے یہ نہیں ہوا کہ لات مار کر اس عورت کو وہاں سے نکال دے۔ اگرچہ وہ چاہتا یہی تھا۔

وہ عورت کمرے کو ذرا سنوار کر تھوڑی دیر بعد چلی گئی لیکن دوسرے دن پھر آئی۔ اسکے دوسرے دن پھر — پھر تیسرے دن۔

خود اس عورت کی زبانی واگیش کو معلوم ہوا تھا کہ وہ آوارہ تھی۔ واگیش کے ہمدردانہ برتاؤ میں نہ معلوم اس نے کیا دیکھ لیا تھا۔ ہر کام میں اس کی مستعدی صرف واگیش کو جیتنے کیلئے تھی۔ اس پر انیس روپے قرضہ بچوں کی کہانی غلط تھی۔ وہ واگیش کی خوشامد کر کے اس سے کچھ ٹھگنا چاہتی تھی۔ وہ بازار میں بیٹھ چکی تھی جیبیں کاٹ چکی تھی۔ اس طرح اور بھی اس نے گناہ کی کہانیاں سنائیں۔

لیکن اس دن واگیش کے الہ آباد سے لوٹ جانے کے بعد سے اس نے محنت سے کام کیا ہے۔ وہ سچ کہتی ہے کہ اس نے حرام کا نہیں کھایا۔ کام کا کھایا ہے۔ اور اس میں سے یہ پچیس روپے بچائے ہیں۔ اس عورت نے ناک پر ہاتھ ٹیک کر کہا کہ یہ روپے اب وہ واپس نہیں لے گی۔

اس طرح تین روز تک واگیش کے پاگل پن اس کی جھڑکیوں اور بدحواسی کے باوجود عورت اپنے گناہوں کی پوری کہانی سنا ہی گئی۔

پھر چوتھے روز واگیش نے کہا "سنو! یہ گلاس اور بوتل ہو رہی ہیں

ٹکٹ آؤ ۔ اور یہ منی آرڈر لکھتا ہوں ۔ ڈاک خانے میں دے آنا۔
اس پر جو پیسے لگیں خرچ کر دینا ۔ اور دو دن یہاں نہ آنا ۔ کیونکہ
پورے دو دن میں سوتا رہوں گا ۔

اس کے بعد ....! ——— وہ کہنا چاہتا تھا
لیکن کہہ نہ سکا ——— میں بھی حرام کا نہیں ۔ کام کا کھاؤں گا ۔

چالیس روپئے آئے اور گئے ۔ پھر آئے اور پھر گئے ۔ اس کا
قصہ یہاں ختم ہوتا ہے ⁂

چراغ گورِ غریباں

پرانی بات ہے۔

شہنشاہ بہادر شاہ دہلی کے تخت پر تھے۔

تھے تو نام کے شہنشاہ ہی لیکن لال قلعہ میں اس وقت بھی رونق تھی۔ لونڈیاں تھیں۔ شاہزادے اور شہزادیاں تھیں۔ بیگمات تھیں اور ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔

ایک روز شام کو ——

شاہزادہ جوان بخت ٹہلتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اچانک انہوں نے دیکھا۔ میلا برقعہ اوڑھے ہوئے ایک عورت آہستہ آہستہ قلعہ میں آ رہی تھی۔ اس وقت قلعہ میں جانے کیلئے آنی رکاوٹ نہ تھی اور نہ ٹکٹ لینا پڑتا تھا۔ غریب اور امیر مصیبت کا مارا اندر جا سکتا تھا۔

کھڑے کھڑے شاہزادے نے دیکھا۔

عورت نوجوان معلوم ہوتی تھی۔ اور انہی کی طرف آ رہی تھی۔

جواں بخت نے ٹہلنا بند کر دیا۔ عورت سیدھی ان کے پاس آئی اور جھک کر آداب کیا۔

"کیا بات ہے" شاہزادے نے پوچھا۔

"حضور" عورت نے ہچکچاتے ہوئے کہا —— "بڑی مصیبت میں پھنس کر حضور کے پاس آئی ہوں" ——

شاہزادے نے سنا۔ بڑی میٹھی درد بھری آواز تھی۔

"کہو" ــــ انہوں نے کہا۔

"میرے آقا!" نوجوان عورت نے کہا ــــ "میرے والد کو کوتوال نے پکڑوا لیا ہے" ــــ

"کیوں"

ایک منٹ ہچک کی عورت کی چمپا جیسی انگلیوں نے سر اٹھا دیا۔ جیسے بجلی کوند گئی ہو۔

جواں بخت دیکھتے رہ گئے۔

"اتنا حسن!"

اور وہ سہمی ہوئی آنکھیں ایک سکنڈ کیلئے شہزادے سے ملیں اور جھک گئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میری وجہ سے" اس نے رکتے ہوئے کہا۔

شاہزادے کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

عورت کا پتہ ٹھکانہ اور باپ کا نام پوچھ کر انہوں نے اسے رخصت کیا دوسرے ہی دن کوتوال شہر سے نکال دیا گیا۔ اور نوجوان عورت کے بوڑھے باپ کی رہائی ہو گئی۔

بات پرانی ہو گئی۔

دہلی میں آگ دہک رہی تھی۔ شہر سے باہر انگریز گھیرا ڈالے پڑے تھے۔

قلعہ میں ماتم سا تھا۔
مغلوں کی آخری گھڑی تھی۔
جواں بخت سوچ رہے تھے۔ اب اس قلعہ میں کس کی حکومت ہوگی۔ تخت پر کون بیٹھے گا۔

اوہ!
اچانک انھوں نے دیکھا — ایک برقعہ سے ڈھکی ہوئی شکل — اور دوسرے لمحہ میں برقعہ کھلتے ہی دیکھا "وہی" —
کہو کیا بات ہے — انہوں نے پوچھا — آج میں کیا کرسکتا ہوں۔ اب تو.......
عورت نے بات کاٹ کر کہا "آپ دہلی سے نکل چلیئے"
شاہزادہ خاموش رہا۔
عورت نے پھر کہا "ابھی وقت ہے۔ میں آپ کو لے چل سکتی ہوں"۔
"تم" — انھوں نے حیران ہو کر پوچھا۔
"دہلی چاروں طرف سے گھری ہوئی ہے۔ تم کیسے جاسکو گی"
عورت کا منہ شرم سے — نہ جانے کس وجہ سے سرخ ہوگیا۔
قدموں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اُس نے آہستہ سے کہا "اس طرف کے پہرہ داروں کے افسر نے....... میری خاطر...... میرے بدلے میں آپ کو......."
جواں بخت سکتہ میں کھڑے رہ گئے۔
"تم...... میرے لئے......" — انھوں نے رُکتے رُکتے پوچھا —

"یہ کروگی"۔
عورت نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "عورت مرد کیلئے کیا نہیں کرسکتی"۔

"عورت......مرد......! اوہ!" شاہزادے کا سر چکرانے لگا۔

چونک کر انھوں نے کہا۔ "تم کل آنا"۔
عورت جھجکی اور......چلی گئی۔
وہ کل نہ آئی۔ دوسرے ہی دن دہلی فتح ہوگئی۔
شہنشاہ بہادر شاہ مع شاہزادوں کے ہمایوں یعنی اپنے خاندان کے بانی کے......مقبرہ میں گرفتار ہوگئے۔
اور پھر خونی دروازہ کے باہر......شاہزادے قتل کردیئے گئے۔
سلطنت خون پر ہی جمتی ہے۔
اس سہمی ہوئی بھیڑ میں سے...... انگریزی فوج کے کمانڈر نے دیکھا ایک عورت کو۔ آہستہ آہستہ شاہزادوں کی لاشوں کی طرف آتے ہوئے......
اس نے آکر جواں بخت کے قدموں سے کچھ خاک اٹھاکر سر پر ڈال لی اور......
کمانڈر۔ فوج۔ بھیڑ۔ اُسے روک نہ سکی۔ نہ پکڑ سکی۔
اور اب برسوں تک شاہزادہ جواں بخت کی سیدھی سادھی سفید قبر پر روز رات کو ایک عورت چراغ جلایا کرتی ہے۔ برسوں گذر گئے۔ صبح کی سیر کرنیوالوں نے اس قبر پر ایک بوڑھیا۔ پھٹے حال۔ کو مرے ہوئے......دیکھا......اور چلے گئے۔

اشوک کا گھوڑا

"سوجا بھیا۔ سوجا! بھیا میرا راجہ بیٹا ہے۔
کبھی ایک راجہ بھی تھا۔ اشوک۔ جب وہ بھیا کی عمر کا تھا تو اپنے بابو کا کہنا جلد مان لیتا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوتا۔ اور جنگل میں شکار کھیلتا"۔ اشوک کی آنکھوں میں ہنسی کھیل رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کھلے جاتے ہیں۔ وہ ہنس رہے ہیں۔ گویا وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے ــــ "چھتال"

"ہاں بھیا! اشوک راجہ ہی نہیں۔ راجاؤں کا بھی راجہ تھا۔ وہ بہادری میں انوکھا تھا"۔

ننھا اشوک بہت کچھ پوچھنا اور معلوم کرنا چاہتا لیکن پوچھتا ہے سارے قصہ کو ایک لفظ میں ــــ "لاجا"

"ہاں بھیا! وہ سب کو پیار کرتا تھا۔ لوگ آج بھی اس کی یاد میں رونے لگتے ہیں"۔ اشوک پیار جانتا ہے اور آنسو۔ کہے بغیر اس سے رہا نہیں جاتا ــــ "بابو پیال! ــــ اول آنجھو بابو!"

"ہاں بھیا

میرا اشوک جب بڑا ہوگا تو ہم اس کیلئے گھوڑا لائیں گے۔ وہ اس پر چڑھے گا۔ اسکے پاس بندوق ہوگی۔ اور وہ شکار کھیلنے ضرور جایا کریگا"

بچہ کی خواہش جاگ اٹھتی ہے ــــ "بابو امے ابی دولا لادو۔ ام چھتال کھیلیں دے"۔

"لیکن میرا اشوک تو ابھی بہت چھوٹا ہے ——— کھلونا ہے"

"بابو امے کھلونا لادو - ام کھیلیں دے"

"کل لادینگے کھلونا اپنے راجہ بیٹے کو - اچھا اب سوجا - تیری ماں سوگئی ہے - اب تو بھی سوجا"

"اول دھولا نہیں لادوے"

"گھوڑا بھی لادینگے بھیا کیلئے لیکن اب سو تو جا"

"بھیا میرا راجہ ہے" تھپ ——— تھپ ——— تھپ -

اشوک آنکھیں میچ لیتا ہے مگر پل بھر میں پھر یکایک جیسے چونک کر آنکھیں کھول کر کہہ اٹھتا ہے ——— "بابو دھولا لادو ام تو ابی لادو بابو"

لیکن اس وقت وہاں گھوڑا کہاں دھرا تھا! پھر اس نے بات آگے بڑھادی "بڑے ہونے پر بھیا کا بیاہ ہوگا - اس کی دلہن آئے گی. راجہ بیٹے کی وہ رانی ہوگی"

"لانی! لانی کیچھی اوتی اے بابو"

راکیش کہنے کو تو کہہ گیا ——— رانی - لیکن اب اسے سمجھائے کیسے - اسکے ذہن میں دو خاکے بن گئے ——— راگنی ——— رانی - مگر پھر وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر رہ گیا ——— راگنی کو تو وہ ہر طرح سے رانی بنا چکا ہے وہ کوئی جواب دیئے بغیر اشوک کو تھپکتا ہی رہا۔

اب اشوک سونے لگا تھا۔

اور راکیش

ٹپ! ٹپ!

ننھے اشوک کی ماں سو رہتی تو کوئی بات نہ تھی۔ ایک پھٹا پرانا لحاف اوپر ڈال کر وہ صرف لیٹی ہوئی ہے۔ اشوک کسی طرح سو جائے وہ اسی انتظار میں تھی۔ اسکے سو جانے بعد وہ اٹھے گی اور لائی چپاتی کے برتن سے نکال کر اپنے شوہر کو دیدے گی وہ اس سے کچھ پوچھے گی نہیں۔ روز روز پوچھنے سے فائدہ کیا ہے۔ اگر کہیں کام مل گیا ہوتا تو آتے ہی بتلا نہ دیتے۔ اتنا ضبط انہیں کہاں ہے۔

لیکن رگیش کو معلوم نہ تھا کہ راگنی حقیقت میں سوئی نہیں ہے اس لئے وہ ماں کی بغل میں کھیلتے ہوئے اشوک کو سلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا ہے کہ راگنی آج دن کے وقت بھی نہیں سوئی۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ کل رات بھر وہ سلائی کا کام کرتی رہی۔ ایک لحاف اس نے سی ڈالا۔ اس سے جو پیسے ملے ان سے اشوک کیلئے آدھی باہوں کا اونی شلوکہ بنایا۔ اس طرح وہ رات دن کی ہاری تھکی ہے۔ سویرے تھوڑی سی کھچڑی ہی بنائی تھی۔ اس وقت اس کا کوئی بندوبست نہیں ہو سکا۔ کھانا پیٹ بھر نہ ملنے کی وجہ سے اشوک کو پلانے کیلئے اسکے جسم میں دودھ بھی نہیں ہے۔ صبح وہ دو پیسے کا دودھ ادھار لے آیا تھا اور وہی اس نے اشوک کو پلا دیا۔

اس وقت رگیش کو یاد آگیا کہ جب وہ سہدیو حلوائی کی دوکان سے دودھ لے رہا تھا تو کسی نے کار سے جاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت اس نے مجھے کیا سمجھا ہوگا۔ پتلون پر چائے اور پان کے دھبے پڑے ہیں۔ وہ کتنا میلا ہو گیا ہے۔ کوٹ کو الٹوانا چاہتا تھا مگر کیسے الٹواتا

آج چار دن سے بالوں میں تیل نہیں پڑا - اور شیو (SHAVE) ! اس نے خیال کیا ہوگا کہ راکیش کی یہ ہیبت ناک حالت ہی اس کا اصلی روپ ہے ایک ٹھنڈا سانس لے کر وہ رہ گیا -

وہ بھی دن تھے جب ریکھا نے پہلی ملاقات میں ہی اپنی مسکراہٹ اسے دے دی تھی ——— دن تھے جب ریکھا نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر "جُھنڈی واس" فلم دیکھتے دیکھتے ہلکے اندھیارے سے بھرے ہوئے اس پیالیس میں اس کے کان میں ایسا کچھ کہہ دیا تھا کہ راکیش کانپ اٹھا تھا - پھر کچھ دنوں بعد دونوں نے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر ایک قسم کھائی تھی لیکن پھر سخت دل باپ .... کی وجہ سے وہ نا امید ہو گیا اور ریکھا کی جگہ راگنی اس کی زندگی میں آگئی - راگنی ایک دُور کے رشتہ دار کی لڑکی تھی اور بچپن ہی سے وہ اس کی تھی - اس کے ساتھ بچپن کی نشانیاں تھیں - بیاہ کی تیاریاں ہو جانے کے بعد کچھ ہیر پھیر پڑ گیا تھا - اور خیال کرنے لگا تھا کہ وہ اب اسے نہیں ملے گی - اس لئے ریکھا کی طرف اس کی نظریں اٹھی تھیں - اور اس شہر میں وہ زندگی کے جھنجھٹوں میں آ پھنسا تو تین سال کے اندر ہی اس کی یہ درگت بن گئی -

لیکن راکیش نے زندگی کی جنگ میں کبھی ہار نہیں مانی - آج بھی وہ ہار ماننے کو تیار نہیں ہے -

---

راگنی اٹھی اور اس نے لائی اور چنا ایک برتن میں لا کر راکیش کے سامنے رکھ دیا - پھر وہ رضائی سے اپنے کو ڈھک رہی تھی کہ راکیش نے کہا

"تم یہ کیا کر رہی ہو راگنی"

"کیوں۔ تم کو کیا کچھ اور چاہیئے۔ اب گڑ بھی نہیں رہا ہے۔ نمک کی کنکریاں تو میں نے رکھ ہی دی ہیں۔ مرچ بھی ہے۔"

"لیکن تم"

"اوہ! میں اب سمجھی! —— گویا جان بوجھ کر مسکراتی ہوئی راگنی نے کانوں کے امی ٹیشن ( ) ایرنگ ( ) ہلاتے ہوئے کہا "لیکن میں تو پہلے ہی چبا چکی ہوں۔ بھوک زور کی لگی تھی جی بھر کر چبا چکی ہوں اور سے دو گلاس پانی بھی پی لیا ہے۔ اب اتنی گنجائش نہیں کہ دو دانے بھی اور کھا سکوں۔ تم بہت بھوکے ہو گے۔ سویرے بھی کھچڑی تم نے بہت تھوڑی کھائی تھی۔ اب تمہیں کھاو۔ ہاں ہاں سچ! یہ لو! میری باتوں کا یقین بھی کرو گے"

راکیش چپ چاپ چنے اور لائی چبانے لگا۔ اس کی زندگی میں آج یہ پہلا دن ہی نہیں ہے مہینوں سے یہی طریقہ چل رہا ہے۔ وہ اس شہر میں "وینک یوگانتر" کے مددگار ایڈیٹر کی حیثیت سے آیا تھا۔ ابھی ایک برس بھی پورا نہ ہونے پایا تھا کہ اخبار بند ہو گیا۔ شروع شروع میں اسے تھوڑا بہت ترجمہ کا کام ملا تھا لیکن آخر میں وہ بھی بند ہو گیا۔ پبلشر سے جو معاوضہ طے ہوا تھا چھ مہینے میں بھی وہ وصول نہیں ہو سکا۔ زمینداری کی آمدنی سے ماں باپ کی ہی گذر بسر ہو سکتی ہے کبھی کچھ ل بھی سکتا ہے۔ لیکن ابھی راکیش نے زندگی سے ہار جو نہیں مانی ہے۔ کیوں وہ مفلس ہو جانے پر اُن کے آگے ہاتھ پسارے۔

ابھی تھوڑے ہی چپ چاپ بیٹھا تھا کہ اس کی آواز بھرآئی۔ کہنے لگا۔

"راگھنی تم سوچتی ہوگی کہ میں ایک بزدل اور نکمے مرد سے بیاہی گئی ہوں۔ اگر تم ایسا خیال کرتی ہو تو یہ بالکل سچ ہے لیکن تم اتنا جان لو میرے راگ! کہ اگر میں دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش شروع کردوں تو اب بھی ہزاروں روپے یہیں بکھر سکتا ہوں۔ یہیں — اسی وقت" —— وہ خاموش ہوگیا۔ ایک آہ بھی کھینچی اس نے —— پھر بولا

"لیکن نہیں۔ میں ایسا بن ہی نہیں سکتا"

راکیش یہ کہہ کر چپ ہوگیا —— پیٹ بھر چپ چاپ کر وہ اٹھا۔ پانی بھی اوپر سے ایک گلاس پی لیا۔ چلتے ہوئے اس نے کہا —— "ایک کام سے جا رہا ہوں۔ ممکن ہے رات دیر سے لوٹوں۔ مٹرو ابھی آئے گا۔ تھوڑا سا دودھ لے کر .... اس کے آنے کا خیال رکھنا"

رات کے نو بجے ہوں گے۔ ریکھا کے بنگلہ کے باہر ابھی بجلی کے چراغ روشن تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے راکیش بنگلہ میں داخل ہوگیا اس وقت اس کا چہرہ صاف تھا۔ داڑھی جڑ سے غائب تھی۔ سر سے لیکر پیر تک وہ مغربی لباس پہنا ہوا تھا اپنے ایک دوست کے یہاں اس نے یہ پوشاک بدلی تھی۔ اور اُسی کی موٹر میں بیٹھ کر آیا تھا ابھی اس نے دروازہ میں پیر رکھا ہی تھا کہ اسے ریکھا سامنے ہی دکھائی دی۔

اس نے راکیش کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور ہاتھ ملایا۔ اس نے کہا ——

"او ہو راکیش! بدقسمتی سے تم نے مجھے اتنے زیادہ عرصہ تک بالکل بھلا دیا تھا"

برسوں پر برس بیت گئے اور ایک چٹھی بھی تم نے نہیں لکھی ۔ کیا حقیقت میں تم وہی راکیش ہو ۔ کیا تم میرے خوابوں کی دنیا کو روشن کرنے والے چاند ہو ۔ میری صحت ۔ میری امیدیں اور میری خوشیاں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکی ہیں اور تم میرے رخصت ہونے کے وقت آئے ہو ۔ تم اور کیا چاہتے ہو ۔ یہاں اب کچھ بھی نہیں رہا ہے ۔ ایک تنکا بھی نہیں ۔ تم اسے لے سکتے ہو ۔ ہاں تم چاہو تو اسے لے سکتے ہو —— ضرور ۔"

راکیش بہت تن گیا ہے ۔ پتھر ۔ وہ تو محبت کا یقین نہیں کرتا ۔ وہ تو اسے ایک "جذبہ" کہتا ہے ۔ فطرت کی ایک کمزوری —— تو ریکھا کیا ہے ۔ کیا وہ بھی فطرت کی اس کمزوری کی قائل ہے ۔ وہ مجبور تو ہے ۔ رات میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے لیکن چہرہ کی بناوٹ تو اب بھی جیسی کی ویسی ہے ۔ اور یہ بات بھی ! ۔ خیر ! ۔

ریکھا اس وقت اسے اپنے کمرے میں لے گئی ۔ وہ اپنی بات کہہ چکی ہے ۔ ماں پاس ہی کھڑی کھڑی کہہ رہی ہے —— "تو ایسی وارفتہ ہو گئی ہے ریکھا ! اور راکیش تم نے ہمیں سچ مچ دھوکہ دیا ۔ کتنے برسوں کے بعد تمہیں یہاں دیکھ رہی ہوں ۔ کیا یہ ٹھیک ہے ۔ ایسا ہی کرنا تھا تو تم نے اس سے محبت ہی کیوں کی تھی ۔ کیوں تم نے اسے اپنا یقین اور اپنی روح کا سکھ اور چین دینے کی فکر کی تھی ۔ ریکھا کے باپ اسی فکر میں چل بسے ۔ اب اس کی باری ہے لیکن نہیں ۔ میری ریکھا اب تو جئے گی ۔ تجھے جینا ہے اور زندگی کا سکھ دیکھنا ہے ۔"

ریکھا کی ماں راکیش کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی ۔ اس کا لہجہ

کانپ رہا تھا تھرتھرا رہا تھا۔ اس کا گلا بھر آیا۔ وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔
رات کے دس بج گئے۔ راکیش کے لئے کھانا لایا گیا۔ لیکن اس نے
کھایا نہیں —— کہنے لگا —— "میں کھا کر آیا ہوں" ریکھا کی ماں نے
بہت اصرار کیا۔ اس کے باوجود وہ نہیں کھایا۔ پھر ریکھا نے بھی التجا کی
مگر نہیں۔ جب سے آیا ہے اس نے ایک بات بھی نہیں کہی۔ وہ صرف
سنتا ہی جا رہا تھا۔ ہاں۔ آنسو ضرور اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔

ریکھا کی ماں چلی گئی۔ راکیش چپ چاپ بیٹھا تھا —— باہر ہوا
تھم تھم کر ہوا چل رہی تھی۔ بنگلے کے درختوں کی پتیاں کھڑکھڑ کی
آوازیں نکال رہی تھیں۔ شوہر سو گیا تھا۔ اور ریکھا پلنگ پر خاموش
لیٹی تھی۔ کمرے میں بجلی کی ہلکی نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ راکیش کا
دل اشوک کی طرف لگا ہوا تھا۔ راگنی کا خیال بھی ساتھ ہی اسے
آ رہا تھا۔ کبھی سوچتا اگر حقیقت میں وہ بھوکی رہ گئی ہو تو......!

راکیش کے چلے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد ہرو آیا۔ اس نے کہا
دودھ نہیں ملا۔ حلوائی کہتا ہے "جب تک پچھلا حساب چکتا نہ ہو جائے
اس وقت تک کوئی سودا نہیں ملے گا"۔ راگنی نے کانوں کے ایرنگ
اتار کر دیئے کہ جو کچھ ملے لے آنا۔ ہرو نے ایک روپیہ کے ایرنگ چار آنے میں
بیچ کر اس سے دو پیسہ کا دودھ اور باقی ساڑھے تین آنے راگنی کو دیئے۔
بچہ سو رہا ہے۔ دن کے وقت اسے پینے کیلئے دودھ نہیں ملا تھا۔
تھوڑے سے چنے اس نے بھی چبائے تھے۔ بھوک کی وجہ سے تھوڑی تھوڑی

دیر سے مچل جاتا تھا۔

"اماں دودھ" —— اور اب جو دودھ آگیا تو وہ سو رہا ہے۔ راگنی خیال کرتی ہے کیوں نہ نیند سے جگا کر دودھ پلا دوں لیکن بچہ کی نیند۔ ہاں بچہ کی نیند کیا اس کی جان سے بڑھ کر ہے۔ دودھ پی کر وہ اور بھی میٹھی نیند سو سکے گا۔

"اشوک اشوک!" —— راگنی اُسے جگانے کی کوشش کر رہی تھی ——

ہوا! ارے" اون — اون — اون!"

"ہاں بیٹا میرا راجہ ہے۔ اشوک شہنشاہ ہوا تھا۔ میرا اشوک بھی شہنشاہ ہوگا پی تو لے دودھ"

"دودھ!" اشوک آنکھیں کھول کر انتہائی خوشی سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دو گھونٹ پی کر —— "چھینچا۔ اماں چھینچا کیا اوا ہے"—— "بیٹا شہنشاہ راجاؤں کا بھی راجہ کہلاتا ہے۔ بڑے سے بڑے راجہ بھی اس کو سلام کرتے ہیں۔ نوکر چاکر محل خزانہ فوج ہاتھی گھوڑے موٹریں جہاز اور ملک سب کچھ اسکے پاس ہوتے ہیں۔ اسکے پاس کسی چیز کی کمی نہیں رہتی۔"

"آتی۔ دھولے۔ بلے بلے۔ اتے بلے" —— دو گھونٹ پی کر وہ اپنے ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹوں سے دودھ کی موتی جیسی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ راگنی کو بتلا رہا تھا۔

"جھٹ سے دودھ پی لے بیٹا پھر سو جا۔ میرا راجہ دودھ پی لیتا ہے۔ یہی چاہیئے مجھے۔ اور کچھ نہیں" —— راگنی سوچتی ہے —— "مجھے اور کچھ

نہیں چاہیئے میرا اشوک سلامت رہے بس۔ وہ فضول اتنا غم کھاتے ہیں۔ نوکری آج نہیں ملی نہ سہی۔ ہمارے گھر کھیت ہیں۔ میں کھیتی کراؤں گی اصل میں اپنا گھر ہی سب کچھ ہے۔ بیکار وہ کچھ اور ہی سوچتے ہیں۔ میں کل ہی ان سے کہوں گی۔ کہ چلو اب ہم لوگ دیہات میں چل کر رہیں۔ لیکن میرے پاس پہننے کو دو چار گہنے اور ساڑیاں........! گانو کے لوگ اور گھر والے کیا کہیں گے۔ جاتے وقت سوچا پاس روپیے تو میرے پاس ہوتے"۔

راگنی رو رہی تھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اور سانس گویا جسم میں سما ہی نہیں رہا تھا۔

اشوک —— دودھ پی چکا۔ وہ اسے سلا رہی تھی لیکن اب بھی اسکی آنکھیں آنسوؤں سے تر تہیں۔

"سو جا بیٹا اب سو جا"

"اول بابو دھولا لے آیں چھپے لے۔ اتا بلا! اچھکے بال اوندے۔ اول دم اندی۔ ام تلیں دے۔ اول چھپال ہیلیں دے۔ بندوت چھپے۔ بابو تے تے تھے"۔

اشوک بات کرتے کرتے ہاتھ پھیلا دیتا تھا۔ اسکے ہونٹ کھل جاتے تھے۔ اور آنکھوں میں مسرت کہیلتی تھی۔

راکیش گویا اس منظر کو اپنے دماغ میں دیکھ دیکھ کر بے چین ہو جاتا کاش وہ اس قابل ہوتا کہ اپنے اشوک کیلئے گھوڑا لا سکتا۔

"اب میں جاتا ہوں ریکھا" — یاس اور حسرت سے کھیلتے ہوئے راگیش نے کہا "وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے"۔
راگیش بے خیالی میں یہ بات کہہ گیا۔ اس نے پہلے سوچا نہیں تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ ریکھا جانتی ہے کہ اسے ایسی حالت میں دیکھ کر راگیش کو ضرور صدمہ ہوا ہے۔ اس لئے اس نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن کہنے کیلئے کوئی بات نہ تھی، یہ وہ نہیں مانتی۔ کیوں اس نے بھلا دیا اس کو۔ اس پر وہ غور کر سکتی ہے۔ مرد کی فطرت کیسی ہے اس کا اندازہ ریکھا نے کر لیا تھا۔ مگر حالات سے انسان مجبور ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتی ہے۔ راگیش نے کبھی اس پر یقین نہیں کیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ سے یہی کہتا آیا ہے کہ حالات کے آگے ہار ماننا بھی انسانی کمزوری ہے۔
جائز اور ناجائز ان دو میں سے ایک کیا ہے اس کا فیصلہ کرنے میں اس سے بھول ہو جاتی ہے اور جب اس سے بھول ہو جاتی ہے تو وہ مصائب کے بھنور میں جا پڑتا ہے۔ لیکن اسوقت ریکھا کھوئی سی بیٹھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ راگیش جو اتنے عرصہ تک نہیں آیا اور جس نے اپنی خیریت وغیرہ کی بھی اطلاع نہ دی شاید اس کی وجہ سے وہ گونگا سا بنا ہے اور واقعی وہ اپنے کئے پر نادم ہے۔ وہ سچ مچ آج اپنے روئیں روئیں کو شرمندگی میں جکڑا پا رہا ہے۔ تو وہ بے قصور ہے اور میرا ہی ہے۔
اس نے میری روح پائی تھی جسم نہ سہی۔ جسم اُسے چاہیئے بھی نہیں لیکن کیوں نہ چاہیئے۔ کیوں نہیں۔ جسم سے بڑھ کر روح کیا ہے۔ مگر اسے اسکی

ضرورت نہ تھی اس وقت اگر وہ یہ بات مان بھی لے تو کیا ریکھا کو بھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ریکھا کو بھی!!

اب ریکھا کے بدن میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ چلا سکے دنیوی امور میں رنج اور بدن کا جو تعلق ہوتا ہے ریکھا اب ان کے حدود سے بھی پرے پہونچ چکی ہے۔ اس لئے تو وہ فانی بدن کے لہو اور گوشت کو پھونک تاپ کر بیٹھی ہے۔ آج وہ صرف نام کی ریکھا ہے۔ کبھی جو زندگی ریکھا تھی آج وہ موت کی ہے۔ کبھی جو شباب کی امنگوں کی تھی تو آج اس حسرت کی ہے۔ اس وقت جو امیدیں اور آرزوئیں تھیں آج وہ سب ایک ایک کر کے قبر بن چکی ہیں۔ آج اس میں سیلاب نہیں ہے۔ آندھی نہیں ہے۔ لپٹ لپٹ جانے والی وہ بجلی بھی نہیں ہے۔ آج تو وہ زندگی کے اس اتھاہ سمندر میں ایک لکیر سی رہ گئی ہے۔ نہ جانے کس لمحہ مٹ جائے۔

ریکھا گھنٹوں یہی سوچتی بیٹھی ہے —— مگر راکیش کو کیا ہو گیا ہے گویا کچھ کہنا ہی بھول گیا ہے۔ اگر اسے کچھ کہنا ہی نہیں تھا تو پھر وہ آیا کیوں ریکھا کے دل میں ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ راکیش نے کہہ دیا

—— اب میں چلتا ہوں ریکھا۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے"۔

"اچھا تو راکیش چلا بھی جائے گا۔ ٹھہرے گا نہیں" —— یہی سوچتے ہوئے ریکھا کو خیال ہوا کہ اس نے یہ تک نہیں پوچھا کہ آج کیسے آ گئے۔ ٹھہرے کہاں ہو اور کب تک رہو گے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب سے ریکھا کی اس سے جان پہچان ہوئی ہے کبھی اس نے راکیش سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تمہارا

گھر کہاں ہے۔ اسی طرح آج بھی وہ یہ نہیں جانتی کہ اس کا راکیش مسلسل کئی برس سے یہیں اسی شہر میں رہتا بستا ہے۔ مگر راکیش نے تو کہا ہے کہ وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے "یہاں" وہ لوگ" کون ہیں اس کے۔ کیا اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ کیا اس نے شادی بھی کر لی ہے۔ نہیں تو پھر "وہ لوگ" کون ہو سکتے ہیں بھلا۔

یہ تو ریکھا نے پوچھ ہی لیا" —— کیا اس مرتبہ ماں کو بھی ساتھ لائے ہو۔ کہاں ٹھیرایا ہے ان کو۔ اُن کو یہاں کیوں نہیں لے آئے"۔

قیامت اگر کل آنے والی ہو تو آج ہی آ جائے۔ راکیش آج اس کی پرواہ نہیں کرے گا۔ آج دنیا میں اس کے لئے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس سے وہ ڈرے۔ مانا کہ ریکھا نے اس سے محبت کی تھی لیکن اس محبت کی غرض و غایت کیا ہے؟ جیسے ایک دن اس نے اسے پسند کر لیا تھا ویسے دوسرے دن وہ دوسرے کو بھی پسند کر سکتی تھی اس دن راکیش کے پاس دکھاوے کو سب کچھ موجود تھا۔ اپنے کالج کا۔ اپنی جماعت کا۔ وہ سب سے خوش قسمت تھا۔ اس کی وضع قطع بھی ایک رئیس کی سی تھی۔ وہ اصل میں چاہے غریب ہو مگر دیکھنے میں کسی امیر زادہ سے کم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ آج بھی وہ جس حالت میں آیا ہے وہ اس کا بھرم ہی بھرم ہے۔ مگر راکیش حقیقت میں آج شش و پنج میں ہے۔ کیا ریکھا اس کی محبت برقرار رکھ سکتی تھی۔ مانا میں آنہ سکا۔ مل نہ سکا۔ خط کی بجائے ایک چٹھی تک نہیں بھیجی اس کے پاس۔ یہ سب میں صحیح مانتا ہوں اس حد تک میں قصور وار ہوں لیکن یہاں سوال تو یہ ہے کہ ایک غریب کی

ایک امیرزادی کیساتھ دوستی کیسی؟ اچھا یہ بھی مان لیا کہ ایسا ممکن ہو بھی جائے لیکن ان قسم قسم کی خواہشوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کے نزدیک محبت کی کیا حقیقت ہے؟

راکیش کو آج اور بھی باتیں یاد آرہی تھیں۔ یہی وہ ریکھا کی ماں ہے، جس نے میرے نوکر سے یہ معلوم کرکے کہ میرے والد کی زمینداری صرف دو آنے کے برابر ہے اپنے گاؤں میں منہ برا بنا کر کہا تھا۔ ''لیکن تمہارے بابو رہتے تو اتنے ٹھاٹ سے ہیں کہ میری ریکھا انہیں تعلقدار سمجھتی ہے''۔ ایک دفعہ شاید ریکھا نے بھی کہا تھا کہ ''پتاجی سے اگر کہوں گی کہ دس ہزار روپیہ دیدیجئے یا اس سے ہندی لکھنے والے ادیبوں کے حوصلہ بڑھانے والی ایک پبلشنگ کمپنی قائم کی جائے گی تو وہ کبھی انکار نہ کریں گے''۔ میری آرزو سے واقف ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی اپنے اس وعدہ کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اگر کبھی جذبات میں ڈوب کر بیخودی کے عالم میں اس پر جان نثار کرنے کا اقرار کر دیا تو وہ وعدہ گویا منضبط ہو گیا۔ اس کے بارے میں سمجھ لیا گیا کہ وہ حقیقت میں محبت کی درخواست تھی۔ اور میں نے شادی کر لی ایک غریب اور مفلس کی لڑکی سے اور اپنی ایک علٰحدہ دنیا بسانے کی کوشش کی یہی گویا ایک بہت بڑا ظلم ہو گیا۔ تو ہم غریب لوگ سماج کی نگاہوں سے اتنے گر گئے۔ اور ان امیر لوگوں کی ناک تو سماج میں ہمیشہ اونچی ہی رہتی ہے۔

کچھ نہیں یہ سب۔ راکیش اس ڈھونگ کا قائل نہیں۔ جب تک کوئی شخص سماج میں اپنا اقتدار نہیں حاصل کر لیتا اس وقت تک

اس پر کسی قسم کی کوئی سماجی پابندی نہیں ہے۔ اخلاق کا ڈھکوسلہ صرف غریبوں سے اپنی طاقت منوانے کیلئے ہے۔ جو غریب اور غلام ہوتا ہے اسکی خودی مرجاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پیر زنجیروں سے جکڑے رہتے ہیں۔ وہ کھل کر چل پھر نہیں سکتا ہنس اور رو نہیں سکتا۔ محبت کرنا وہ کیا جانے۔

خودداری اور آزادی کے بغیر وہ ایک بے جان شئے ہے۔ مردہ ہے۔ جس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں جس کے جسم میں حرارت اور دماغ میں کوئی امنگ نہیں ہے۔ اس کے پاس دل بھی نہیں ہے۔ محبت کیا چیز ہے اس کے لئے۔ میں پہلے روٹی چاہتا ہوں۔ محبت نہیں۔ محبت تو تم لوگوں کا چونچلہ ہے۔ اُن کا ڈھکوسلہ اور تماشہ ہے جن کے کتے مکھن بسکٹ اور ٹوسٹ چاہتے ہوں۔ ریکھا مر رہی ہے تو مر جائے۔ کسی غریب ڈوم کو اس کی لاش پر کا دوشالہ مل جائے گا۔ اس سے اس کی بیوی بچوں کا تن کچھ ڈھک جائے گا۔ دنیا میں ہزاروں آدمی روز مرتے ہیں۔ ریکھا کے مرنے سے اس دنیا میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ زندگی کے سمجھنے میں اگر کسی نے کوئی غلطی کی ہے تو اس کا صلہ وہ خود پائے گا کسی دوسرے شخص پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ راگنی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اس سے مجھے اشوک ملا ہے اور میں اپنے میں خوش ہوں۔ نازاں ہوں۔ ریکھا کے پاس سب کچھ تھا لیکن اُس نے کچھ نہ دے کر صرف ایک حقیر سی شے دی ہے۔ ایک جرم۔ راکیش کو یہ نہیں چاہیئے۔ وہ اس سے کچھ نہیں چاہتا۔

آج راکیش کی آنکھوں میں مسرت نہیں ہے۔ رحم نہیں ہے۔

یہ چیزیں تو انسان میں اس وقت تک رہتی ہیں جب تک وہ اپنی زندگی میں ایک قسم کا سکھ اور آرام دیکھتا ہے۔ راکیش اپنے آپ کو اس مقام سے آگے دیکھ رہا ہے۔ آج انصاف کے نام پر اس کی خودداری کچلی جا رہی ہے۔ نہیں تو موت کے دروازہ پر پہونچتی ہوئی عورت کے سامنے اس کی ساری بغاوت ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

اب بھی راکیش کی آنکھیں تنی ہوئی ہیں۔ اب بھی وہ غم کی لہٹوں سے کھیل رہا ہے۔ گرم کرتے کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر وہ کھڑا ہو گیا۔ اور کہا "میں نے شادی کر لی ہے ریکھا۔ میرا ایک بچہ بھی ہے"۔

"سچ مچ۔ ارے واہ!" خوشی اور اشتیاق کے جذبہ میں ڈوبی ہوئی ریکھا نے کہا۔ "تم کتنے کیا ہو پیارے۔ کیا حقیقت میں تم اب ایک شادی شدہ میاں بیوی ہو؟ ایک بچہ بھی ہے تمہارا۔ پھر تو واقعی یہ دنیا ایک جنت ہے حقیقت میں جنت ہے۔ میں تم کو دلی مبارک باد دیتی ہوں............ اب میں تمہیں جانے نہ دوں گی۔ کل سویرے میں بھی تمہارے گھر چلوں گی۔ اور بہن کو دیکھ آؤں گی میں بچہ کو کھلاؤنگی۔ آج رات کی رات یہاں رہ جاؤ۔ چاہے تو آدمی بھیج کر اطلاع کر دو۔ ٹھیک تو ہے۔ شوفر سے کہہ دو کہ وہ لوٹ جائے"۔

راکیش پھر کرسی پر بیٹھ تو گیا مگر اس کی نظریں اب کی دفعہ نیچی رہ گئیں۔ اس کے شرم آلود چہرے پر اب ایک فتح کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس بات کو سنکر ریکھا غش کھا جائے گی۔ ممکن ہے اس کا خاتمہ ہی ہو جائے لیکن اس کا چہرہ اس وقت کتنا بشاش ہے

خوشی سے جیسے پاگل ہوگئی ہو۔ تو حسد، بغض، بغاوت اور انتقام سے بھی آگے یہ ریکھا کچھ اور ہے کیا؟

راکیش کے دماغ میں ابھی ان خیالات کا تجزیہ ہو رہا تھا کہ ریکھا نے کہا "چپ کیوں ہو گئے۔ اٹھو اور شوفر سے کہہ دو کہ اب وہ لوٹ جائے۔ ہم لوگ کل سویرے آئیں گے۔ بڑی دور بھی تو ہے گھر یہاں سے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اور جاڑا کتنا سخت ہے۔ جاؤ۔ اٹھو — اچھا بیٹھے رہو میں نوکر کو بلاتی ہوں"۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔

اشوک سو رہا ہے لیکن اسکے ہونٹھ کانپ رہے ہیں حلق سے کچھ آواز نکل رہی ہے۔ اور چہرہ پر خوشی کے آثار ابھر رہے ہیں۔

"ام دھولے پل پھیلیں دے ...... ہ جھتال پھلیں دے۔ ام بندوت تلائیں دے چھپا مین دے۔

راگنی کے آنکھوں کے آنسو اس کے گلابی گالوں پر آ کر سوکھ گئے تھے۔ اس کا جسم اینٹھا جا رہا تھا۔ رواں کانپ رہا تھا۔ پیشانی جل رہی تھی اور ہاتھ پیر شل ہوتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسی حالت میں بھی وہ سوئے ہوئے اشوک کا منہ چوم لیتی اور پھر دروازہ پر کھڑی ہو کر دیکھتی ہے اور گر پڑتی ہے۔

اشوک سو رہا ہے لیکن خوشی سے اچھل اچھل پڑتا ہے۔ دھندلی روشنی میں راگنی اس کی طرف غور سے دیکھتی اور دیکھتی رہ جاتی ہے۔

"دھولائیں دے! بندوت ...... چھپاہ! دھولا ...... دھولا!

بند ہو ت ! چھنچھاہ ! "۔

پاس ہی پڑی ہوئی راگنی سسکیاں لے رہی تھی ۔ اور تڑپ رہی تھی ۔ راگنی اٹھ بیٹھی اور راشوک کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے ۔ ٹپ ٹپ آنسو گر رہے ہیں ۔ راگنی کی پلکیں موندی ہوئی ہیں اُسے نیند آ رہی ہے ۔

جیسے بہت کچھ کہنا چاہئے تھا وہ اب بھی چپ ہی ہے ۔ کیوں —— ریکھا کو اس کا علم ہے ۔ وہ آگ جو اس کے سینہ میں دہک رہی ہے اس کی تپش اسے جلانے کی بجائے پھول بن کر بکھر پڑتی ہیں ۔

"تم نے خیال کیا ہو گا راکیش ۔ ریکھا کو تم سے شکایت ہو گی لیکن تم نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ وہ تمہیں کتنا چاہتی ہے ۔ خواہش اور حسن کے جذبہ کے آگے راکیش نے کبھی ہار نہیں مانی ۔ کیا میرے لئے ابھی یہ جاننا باقی ہے ۔ کیا میں اتنا بھی جان نہیں سکتی تھی کہ تم مجھ سے کبھی شادی نہیں کرو گے ۔ ہوس اور جذبات کی دنیا میں پلی ہوئی عورت سے بیاہ کرنا تمہارے لئے کبھی ممکن نہیں ہو سکتا ۔ یہاں تک تو بالکل ٹھیک رہا لیکن میں یہ نہ جان سکی تھی کہ تم مجھے بھول ہی جاؤ گے کبھی میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ محبت کی حکومت میں غریب اور امیر کا فرق تمہیں مجھ سے اتنی دور لے جا کر کھڑا کر دیگا کہ میں تمہیں دیکھ ہی نہ سکوں گی ۔

ریکھا آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہی تھی۔ جملوں کے ٹکڑے ٹکڑے بنتے تھے۔ الفاظ صرف حلق تالو اور ہونٹوں کے بجائے آنکھوں کی پتلیوں اور پلکوں اور چہرے کے آثار چڑھاؤ سے اپنا اظہار کر دیتے تھے کبھی جو کراہ جاتی تو اس کی تکمیل کے لئے تھوڑے سے آنسو کبھی ریکھا کے بیچ رہے تھے۔ راکیش ریکھا کی ان باتوں کو سن کر خاموش نہ رہ سکا یقین کے ساتھ نڈر ہو کر اس نے کہا " تمہارا خیال غلط ہے ریکھا۔ دنیا کو تم محبت کی حکومت کہتی ہو لیکن کہاں ہے محبت۔ جن کے پاس تن ڈھکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کیلئے روٹی کا ٹکڑا نہیں ہے کس نے دی ہے انھیں محبت۔ مجھے تو کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ غلام اور فاقہ کش زندہ لاشوں میں محبت دیکھنے کی یہ کوشش سراب سے کم نہیں ہے ریکھا"۔

کچھ دیر کیلئے ریکھا خاموشی کے ساتھ غور کرتی رہی۔ وہ جواب کی تلاش کر رہی تھی لیکن وہ اسے مل ہی نہیں رہا تھا۔ پھر خود راکیش ہی بول اٹھا اب کی دفعہ کرسی کے پیچھے ہاتھ ٹیک کر وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

" کہنا چاہو تو کہہ ڈالو ریکھا کہ جو غریب اور سچا ہے اُسے خدا کی محبت حاصل ہے۔ لیکن ہے یہ ایک اندھا یقین "۔

یہ کہہ کر راکیش چپ ہو گیا۔ بظاہر وہ خاموش تو ہو گیا لیکن دل ہی دل میں اس کے آگے بھی کہتا گیا۔

" تو میں یہ کب کہتی ہوں۔ خیر جانے دو" ۔۔۔ ریکھا نے کہا ۔۔۔ " تم نے اچھا کیا۔ لو اب تو خوش ہو! برا اگر کچھ کیا تو اتنا کہ آج بھول پڑے! کیوں وہ حقیقت میں میں اپنے آپ کو بہلانے آیا ہوں ریکھا" یہ کہتے کہتے

راکیش نا امید ہو کر اٹھا لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بھول نہیں سکتا۔

صبح کا وقت ہے۔ ہولی کی رنگین صبح کا وقت۔
ریکھا کی موٹر مرمت کیلئے گئی ہوئی ہے۔ وہ ایک دوسری سواری میں راکیش کے ساتھ جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ اس کی ماں بھی ہے۔

سڑک پر گاڑی کھڑی کر دی گئی۔ ایک بدبودار اور گندی گلی میں آگے آگے راکیش جا رہا ہے اور پیچھے پیچھے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھے۔۔۔ آہستہ آہستہ۔۔۔ ریکھا۔ اس کی ماں نے ناک سے رومال لگا لیا ہے کسی طرح سب گھر کے اندر پہونچتے ہیں۔

کواڑ کھلے پڑے ہیں۔ لالٹین اب بھی جل رہی ہے۔ مگر دھوئیں سے کالی پڑ گئی ہے۔ کوٹھری کے فرش پر پرال بچھا ہوا ہے۔ اور اس پر راگنی لیٹی ہوئی ہے۔ اس کی ساڑھی پھٹی ہوئی ہے۔ اور میلی اتنی ہے کہ کیچڑ کے رنگ کی ہو گئی ہے۔ رزائی اور بچھونے کی بھی یہی حالت ہے۔

باپ کو دیکھ کر اشوک اس کے قدموں سے لپٹ جاتا ہے۔ اور سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر کہتا ہے۔۔۔ "بابو تم تب تیوں او۔ بولتے تیوں نئیں........"

"بابو اماں چھوتی ایں۔ اتھاؤ اُن تو۔ اتھاو بابو!"

"........"

"بابو تم امیں دھولائیں لائے۔ بولو بابو"

لیکن راکیش خاموش کھڑا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہا ہے

ریکھا نے اشوک کو گود میں لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”آجا میرے راجہ بیٹے - میں تیرے لئے گھوڑا لائی ہوں - خوب بڑا سا گھوڑا اور یہ ایک دس ہزار روپیہ کا چیک - یہ رہا لفافہ میں“

لیکن یہ بات کیا ہے - راگنی کے بدن پر رضائی نہیں ہے سارے لوگ باری باری سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے گویا اپنے آپ سے پوچھ اُٹھتے ہیں ——

منہ اس کا تکیہ پر کھلا رکھا ہے - وہ ایک طرف تھوڑا ڈھل بھی گیا ہے - اس پر مکھیاں بھنک رہی ہیں - پاس ہی ڈھیر کی ڈھیر بدبو دار رال بھی پڑی ہوئی ہے -

دوسرے دن وہاں چھپے ہوئے رنگین کاغذ کے کچھ ٹکرے پڑے رہجاتے ہیں اور راکیش اشوک کو کبھی چھاتی سے لگائے اور کبھی کندھے پر بٹھائے سرپٹ چال سے ایک طرف چلا جا رہا ہے —— چلا جا رہا ہے —— کون جانے کدھر ——

دشمن

علم کو ایک رات خواب میں خدا نظر آیا۔ خدا نے کہا —— "علم۔ میں نے تجھے اپنا نائب بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اُٹھ۔ دنیا کی بھلائی کر"
علم جاگ پڑا۔ اس نے دیکھا۔ دنیا تاریکی میں پڑی ہے اور انسان اس تاریکی میں گمراہ ہو کر تباہی کی طرف بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ وہ خدا کا نائب ہے تو اسے انسانوں کو سیدھے راستہ سے لگانا ہوگا۔ اندھیرے سے باہر لانا ہوگا۔ اس کا نائب بن کر اس کے دشمن سے جنگ کرنی ہوگی۔

اور وہ جا کر چوراہے پر کھڑا ہوگیا۔ سب کو مخاطب کر کے کہنے لگا —— "میں مسیح ہوں۔ پیغمبر ہوں۔ خدا کا نائب ہوں۔ میرے تمہاری بھلائی کیلئے ایک پیغام ہے"

لیکن کسی نے اس کی بات نہیں سنی۔ کچھ اس کی طرف دیکھ کر ہنس پڑے۔ کچھ کہتے پاگل ہے۔ مذہبی پیشوا کہتے۔ یہ ہمارے مذہب کے خلاف تعلیم دیتا ہے۔ ملحد ہے۔ اسے مارو اور بچے اسے پتھر مارا کرتے۔

آخر تنگ آ کر وہ ایک اندھیری گلی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ خدا کی مخلوق کا سب سے بڑا

دشمن مذہب ہے۔ اس سے لڑنا چاہیے۔

اس وقت کہیں قریب ہی عورت کی درد سے بھری آہ وزاری سنائی دی۔ اس نے دیکھا۔ ایک عورت خاک پر لیٹی ہے۔ اس کے پاس ہی ایک چھوٹا سا بچہ پڑا ہے۔ جو یا تو بیہوش ہے یا مر چکا ہے۔ کیونکہ اس کے جسم میں کسی قسم کی حرکت نہیں۔

علم نے پوچھا ——"بہن کیوں روتی ہو"

اس عورت نے جواب دیا—"میں نے ایک ملحد سے بیاہ کیا تھا۔ جب لوگوں کو اس کا پتہ چلا تو انھوں نے اسے مار ڈالا اور مجھے نکال دیا۔ میرا بچہ بھی بھوک سے مر رہا ہے۔"

علم کا ارادہ اور بھی مصمم ہو گیا۔ اس نے کہا—"تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھاری حفاظت کروں گا۔" اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

علم نے مذہب کے خلاف پرچار کرنا شروع کیا۔ اس نے کہا—"مذہب ایک جھوٹا بندھن ہے۔ خدا ایک ہے۔ غیر فانی ہے۔ اور مذہب سے پرے ہے۔ مذہب ہمیں محدود رکھنا چاہتا ہے۔ روکتا ہے۔ خدا سے الگ رکھتا ہے۔ یہانتک کہ وہ ہمارا دشمن ہے۔"

لیکن کسی نے کہا—"جو مرد پرائی اور سماج کی ٹھکرائی عورت کو اپنے ساتھ رکھتا ہے اس کی ہم کیوں سنیں— وہ

سماج کا مجرم ہے۔ نیچ ہے"۔ پھر لوگوں نے اسے سماج کا مجرم قرار دے کر باہر نکال دیا۔

علم نے دیکھا کہ مذہب سے لڑنے سے پہلے سماج سے لڑنا ہے۔ سماج پر فتح نہیں ملتی تب تک مذہب کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

پھر وہ اسی طرح سوچنے لگا ـــ وہ کہنے لگا ـــ "یہ مذہبی پیشوا ـــ یہ پنگی پروہت ـــ ملا ـــ یہ کون ہیں ـــ انھیں کیا اختیار ہے ہماری زندگی کو باندھ رکھنے کا ـــ آؤ ہم انھیں دور کر دیں۔ ایک عالمگیر سماج کی بنیاد ڈالیں۔ تاکہ ہم امن اور اطمینان کی جگہ بیٹھ سکیں"۔

ایک دن غیر ملکی حکومت کے دو سپاہی آکر اسے پکڑ لئے۔ کیونکہ وہ شاہراہ عام پر بغاوت کی آگ سلگا رہا تھا۔

علم جب جیل کاٹ کر باہر نکلا تو اس کے سینہ میں ان غیر ملکیوں سے انتقام کی آگ دہک رہی تھی "یہی تو تمہاری آزادی چھین کر تمہیں غلام بنایا کرتے ہیں۔ اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پہلے اپنے کو غیر ملکی قوت سے نجات حاصل کرنی ہوگی۔ پھر ـــ" اور وہ چھپا چھپا غیر ملکیوں کے خلاف لڑائی کی تیاریاں کرنے لگا۔

ایک دن اس کے پاس ایک غیر ملکی آدمی آیا۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے خاکی کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر جھریاں پڑی تھیں۔ آنکھوں میں ایک تنکھا درد تھا۔ اس نے علم سے کہا ـــ "آپ مجھے کوئی کام دیں تاکہ میں اپنی روزی کما سکوں میں غیر ملکی ہوں۔ آپ کے ملک میں بھوکا

مر رہا ہوں۔ کوئی بھی کام مجھے دیں میں کروں گا۔ آپ امتحان لیں۔ میرا میرے پاس روٹی کا ٹکڑا بھی نہیں ہے۔"

علم نے جھلا کر کہا۔" میری حالت تم سے کچھ بہتر نہیں ہے۔ میں بھی بھوکا ہوں" وہ غیر ملکی یکایک حیرت زدہ سا ہو گیا۔ بولا۔" اچھا میں آپ کی تکلیف سے بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنا بھائی سمجھیں۔ اگر ایک سے دو ہوں تو بھوک مٹانا معمولی بات ہے۔ خدا آپ کی تکلیف دور کرے میں آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہوں۔"

علم نے دیکھا کہ ملکی غیر ملکی کا سوال اس وقت اٹھتا ہے جب پیٹ بھرا ہو۔ سب سے پہلا دشمن تو یہ بھوک ہی ہے۔ پہلے بھوک کو جیتنا ہو گا۔ اس کے بعد ہی آگے کچھ سوچا جا سکتا ہے۔

پھر اس نے بھوک کے لڑاکوں کی ایک فوج بنانی شروع کی۔ جس کا مطلب تھا امیروں سے دولت چھین کر سب میں برابر تقسیم کرنا۔ بھوکوں کو روٹی دینا۔ لیکن جب امیروں کو اس بات کا پتہ چلا تو ناہوں نے ایک دن چپ چاپ اپنے لوگوں کے ہاتھوں اسے پکڑوا منگایا۔ اور ایک پہاڑی قلعہ میں قید کر دیا۔ وہاں تنہائی میں وہ اُسے تکلیف پہونچاتے ایک آدھ مٹھی چنا چبینہ اور ایک لوٹا پانی دے دیتے بس۔

آہستہ آہستہ علم کا دل ٹوٹنے لگا۔ زندگی اسے بوجھ سی معلوم ہونے لگی۔ ہر وقت یہ خیال اس کے دل میں آیا کرتا کہ میں "علم" خدا کا نائب اس قدر مجبور رہوں کہ پیٹ بھر روٹی پا لینا بھی میرے لئے

ناممکن ہے - اگر ایسا ہے تو کتنی بے مزہ ہے یہ زندگی - کتنی بے کیف اور کس قدر بے معنی -

ایک دن وہ قلعہ کی دیوار پر چڑھ گیا - باہر کھائی میں بھرا ہوا پانی دیکھتے دیکھتے اُسے ایک دم سے خیال ہوا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس میں کود کر جان دے دے گا - خدا کے پاس لوٹ کر التجا کرے گا کہ مجھے اس عذاب سے نجات دلا - میں تیرا نائب تو ہوں - لیکن اسی دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہیں -

ٹکٹکی لگا کر کھائی کے پانی میں دیکھنے لگا - وہ کودنے ہی کو تھا کہ یکایک اس نے دیکھا --- پانی میں اس کا سایہ جھلک رہا ہے - گویا وہ اس سے کہہ رہا تھا --- بس اپنے آپ سے لڑ چکے ؟

علم سہم کر رک گیا - پھر آہستہ آہستہ دیوار سے نیچے اتر آیا - اور قلعہ کے چکر کاٹنے لگا -

اور اس نے معلوم کر لیا کہ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ انسان ہر وقت آسانی کی طرف بڑھ جاتا ہے -

گورا

کہہ نہیں سکتے کہ ایک سکھی زندگی کی اصل پہچان کیا ہے۔ پھر بھی اتنا معلوم ہے کہ جیون ایک سکھی کسان تھا۔ سکھی ہونے پر بھی وہ قسمت کا بہت ہی کھوٹا تھا۔ گاؤں کی سرحد جہاں جنگل سے ملتی تھی اس جگہ کی بیس پچیس بیگہ معمولی قسم کی زمین پر اس کا موروثی حق تھا۔ اس کے گھر میں بیوی اور تین بچے بھی تھے۔ گھر گرہستی کے لئے اس کے پاس کوئی زیادہ سامان نہیں تھا۔ مربہ اور پراٹھے نہ سہی نمکین ستو ہی سہی —— یہ لوگ کسی نہ کسی طرح پیٹ کے گڑھوں کو بھر ہی لیتے تھے۔ میاں بیوی میں خوب محبت تھی۔ دونوں ہنس مکھ اور اچھے برتاؤ کے لوگ تھے۔ جیون محنتی آدمی تھا۔ اسے کام کرنے کا شوق تھا —— گویا وہ اس کے لئے بہانے ڈھونڈھتا ہو۔ ربیع کی فصل کٹ جانے کے بعد بھی اسے کسی نے ستاتے نہیں دیکھا۔ ان دنوں کے لئے وہ پہلے ہی سے اپنی زمین کے چار چھ بیگہ یا اس سے کم زیادہ زمین کو گھیر گھار کر تیار کر رکھتا تھا۔ یہاں خربزے بوئے جاتے تھے۔ جیون کے وہ دن بڑے مزے میں کٹتے تھے۔ خربزوں کے کھیت میں جامن کی گھنی چھاؤں کے نیچے پھونس کی ایک ذرا سی جھونپڑی —— یہی جیون کے خربزوں کا اسٹور ہاؤز تھا۔ اور یہی اس کے بال بچوں کے رہنے کا مکان — بیساکھ کے مہینہ کے گرم دنوں کی

دوپہر جامن کے اسی پیڑ کی چھاؤں میں کٹا کرتی تھی۔ مغرب کے بعد دن بھر تکنے سے بچے ہوئے خربزوں کے ساتھ گیہوں کی روٹی کھا کر وہ لوگ خدا کو دعائیں دیا کرتے تھے۔ انہیں نہ مالداروں سے غرض تھی نہ زمینداروں کا خوف۔

بیساکھ کے مہینہ کی کسی چاندنی رات کو پاس ہی سے ایک ہلکی سی آواز سن کر جیون کی نیند اچٹ گئی۔ قریب آدھی رات گذر گئی تھی جیون کو خوف ہوا کہ کہیں بارٹھ چاند گیدڑ تو کھیت میں نہیں گھس آئے۔ لیکن ایک بار چاندنی میں اپنے کھیت کو اچھی طرح سے دیکھ کر اس کا یہ شبہ دور ہو گیا۔ اس وقت پھر اسے وہی آواز سنائی دی۔ یہ آواز سن کر جیون پہچان گیا کہ کھیت کے پاس والے جنگل میں کوئی جنگلی جانور کسی گائے کے بچھڑے پر حملہ کر رہا ہے۔ اپنے کھیت میں کسی قسم کا خطرہ نہ دیکھ کر پہلے تو جیون کے دل میں یہ خیال ہوا کہ —— نہ جاؤں۔ کیوں مفت میں ایک بچھڑے کیلئے اپنی جان خطرے میں ڈالوں —— لیکن بار بار "ہاں —— ہاں" کی درد بھری چلاہٹ سن کر وہ رہ نہ سکا۔ جیون کھاٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا اور دوسرے ہاتھ میں ٹوٹی ہوئی چمنی والی برسوں کی ہریکن لیمپ لے کر وہ اسی رخ چل دیا جس طرف سے وہ آواز آ رہی تھی۔

کھیت کی حد سے لے کر جو جنگل میلوں تک پھیلا ہوا تھا اس کا آخری حصہ گھنا نہیں تھا۔ معمولی جھاڑیوں اور ڈاک کے پیڑوں کے سوا کوئی بڑا درخت وہاں نہیں تھا۔ جنگل میں پہنچ کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ ایک چھوٹے سے بچھڑے پر چار پانچ

گیدڑ حملہ کر رہے ہیں۔ اور وہ بیچارہ زمین پر لٹتا ہوا درد بھری آوازیں "باں ——— باں" کر رہا ہے۔ ایک لیمپ سنبھالتے ہوئے آدمی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر سب گیدڑ بھاگ کھڑے ہوئے۔ جیون نے پاس جاکر دیکھا کہ بچھڑے کو بہت زیادہ زخم نہیں لگے ہیں۔ صرف اس کی اگلی دائیں ٹانگ اور پیٹ کا کچھ حصہ ہی زخمی ہوا ہے۔ جیون اندازے سے پہچانا کہ اس کی عمر دو مہینے سے زیادہ معلوم ——— ہوتی تھی۔ بچھڑے کا رنگ بالکل سفید تھا اور اس کے ماتھے پر لال تارہ کا نشان بنا ہوا تھا۔ جیون بچھڑے کو آہستہ سے گود میں اٹھا کر اپنی جھونپڑی میں چلا گیا۔

سویرے اٹھ کر جیون نے جانچ کر کے دیکھا کہ بچھڑے کی ذات بہت اچھی تھی۔ اگر کچھ حفاظت سے پالا جائے تو وہ ایک بہت عمدہ بیل بن سکتا ہے۔ جیون کی گھروالی ابھی سو رہی تھی کہ جیون نے اس بچھڑے کو اس کی چارپائی پر ڈال دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس طرح اچانک نیند سے جاگ جانے کا مطلب بھی ابھی پوری طرح سمجھنے نہ پائی تھی کہ اس نے سنا جیون کہہ رہا تھا ——— "پرمیشور نے پالنے کیلئے تمہیں ایک اور بچہ دیا ہے"

میاں بیوی دونوں نے ٹھنڈے دل سے خوب سوچ بچار کر
اس بچھڑے کا نام رکھا ——— "گورا"

جیون کی قسمت اچھی تھی ——— اسکے علاج سے گورا کے دونوں گھاؤ جلد ہی بھر گئے۔ اچھا ہو کر وہ خوب کودنے پھاندنے لگا۔ کچھ ہی مہینوں میں گورا کا ڈیل ڈول خوب بھر آیا۔ اس کے

کندھے سڈول اور پٹھے مضبوط ہو گئے۔

(۲)

دیکھتے ہی دیکھتے "گورا" ایک بڑا ڈیل ڈول والا بیل بن گیا۔ اسکے مقابلہ کا بیل آس پاس کے کسی گاؤں میں ملنا مشکل تھا۔ اس کی چال ہاتھی کی طرح مستانہ تھی۔ اور اس کی گرج بادل کی گرج کیطرح دہلا دینے والی۔ لوگ اُسے اب تعجب سے دیکھتے۔ اور جیون کی قسمت کو سراہا کرتے تھے۔

جیون کو گورا سے اپنے بچوں کی طرح محبت تھی۔ روزانہ دونوں وقت محنت کر کے وہ اس کے لئے کھلی تیار کرتا تھا۔ وہ اسے کبھی کبھی تیل اور گھی بھی پلایا کرتا تھا۔ جیون کی گھر والی کو تو گورا سے ایک قسم کا موہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے ہر وقت آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے بچے اس پہاڑ جیسے بیل کی چوڑی چھاتی کے نیچے کھڑے ہو کر اس کے گلے کی نرم اور خوب صورت لڑیوں کو اپنے چنچل ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ہلایا کرتے۔ گورا آنکھیں بند کر کے بچوں کی اس معصوم محبت کا مزہ اٹھایا کرتا تھا۔

گورا کے ڈیل ڈول کا دوسرا بیل جیون کے پاس تو کیا گاؤں بھر میں نہیں تھا اس وجہ سے جیون اُسے ہل میں نہیں جوت سکتا تھا۔ بہی دیکھ بھال کر کے لوگوں نے ایک ایک ہزار روپیوں تک دام لگا کر گورا کو جیون سے خرید لینا چاہا۔ لیکن جیون کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا کبھی دھن کی لالچ سے کوئی اپنی اولاد کو بھی بیچتا ہے؟ جیون کے پاس

ایک معمولی سی گاڑی تھی۔ وہ گورا کو اس میں جوتا کرتا تھا۔

جیون کے گاؤں کے نزدیک ہی ایک بہت بڑا سرکاری میدان تھا۔ لوگوں میں مشہور تھا کہ اسلامی حکومت کے دنوں میں راہ چلتی ہوئی فوجیں اس میدان میں پڑاؤ کیا کرتی تھیں۔ آج کل یہ میدان ایک نمائش کے کام میں لایا جاتا تھا۔ یہاں سال میں ایک دفعہ سرکار کی طرف سے جانوروں کی ایک بڑی بھاری نمائش کی جاتی تھی۔ دور دور کے لوگ اس نمائش میں اپنے جانوروں کو لاتے تھے۔ جو جانور سب سے اچھی صحت اور ڈیل ڈول کے ہوتے تھے انھیں سرکار کی طرف سے انعام بھی دیا جاتا تھا۔

گاؤں کے زمیندار کا نام تھا لکھپت رائے۔ وہ بے پرواہ کاہل اور افیونی آدمی تھے۔ گاؤں کے کام کاج میں کسی قسم سے دخل دینا انھیں پسند نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس گاؤں کے کسانوں کو سال کے کسی دن بھی زمیندار سے کوئی زیادہ شکایت نہیں رہتی تھی۔ لیکن جن دنوں زمیندار کو دعوت، شکار یا سرکاری افسروں کی خاطرداری کرنے کا خبط سوار ہوتا تھا۔ ان دنوں گاؤں والوں پر آفت آجاتی تھی۔ نمائش کے مہینے میں جب ضلع کے کچھ چھوٹے موٹے افسر انتظام کا کام کرنے کے لئے اس جگہ آتے تو اس وقت ان کی خاطر کرتے کرتے کسانوں کی جان نکلنے لگتی تھی۔

جانوروں کی نمائش میں حصہ لینے کا زمیندار کو خاص شوق تھا۔ اس نے کچھ بیل اور گھوڑے محض اس کام کیلئے پال رکھے تھے۔ زمیندار کے جانور تھے۔ کھانے پینے کی کیا کمی۔ خاص کر نمائش کے دنوں میں ایک ایک جانور کے پیچھے چار چار کسان دن رات بھاگے

پھرتے تھے۔ نمائش کا سب سے پہلا انعام کئی برسوں سے لکھپت رائے کو
اس کے بیل کے لئے مل رہا تھا۔ اس سال بھی زمیندار کو یقین تھا کہ
نمائش کا سب سے پہلا انعام اسی کے ہاتھ رہے گا۔

لوگوں کو یقین تھا کہ زمیندار کے بیل کا گورا سے کوئی مقابلہ ہی
نہیں ہے۔ اگر دونوں بیلوں کو لڑا دیا جائے تو گورا ایک ہی ٹکر میں زمیندار کے
بیل کو زمین پر پٹک دے۔ اس لئے لوگ جیون کو اس سال کے نمائشی
مقابلہ میں شریک ہونے کے لئے زور دے رہے تھے۔ مگر وہ انکار کر رہا تھا۔
لیکن یار لوگ بھی کب ماننے والے تھے۔ خاص کر جو لوگ ہر سال زمیندار سے
ہار مانتے تھے وہ بھلا اس آسان موقع کو کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے۔
آخر لوگوں نے اس سال کی مویشیوں کی نمائش میں شامل ہونے
کیلئے جیون کو آمادہ کر ہی لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال کی مویشیوں کی
نمائش کا انعام زمیندار کو نہیں مل سکا۔ گورا ہی اس انعام کا
مستحق سمجھا گیا۔

(۳)

جیون اپنی گاڑی کو گھر کی طرف دوڑائے لئے جا رہا تھا۔
گورا کی یہ خالی گاڑی پھول کی مانند ہلکی تھی۔ گورا نے کل ہی
نمائش میں ناموری حاصل کی تھی۔ اس لئے جیون نے اسے آج بہت سا
گھی پلایا تھا۔ گورا کے گلے میں اس نے پھولوں کی ایک مالا ڈال رکھی تھی
جانور ہوتے ہوئے بھی گورا یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا مالک اس سے بہت
خوش ہے۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا جیون اپنی ٹوٹی پھوٹی ہوئی آواز میں کوئی

خوشی کا گیت گا رہا تھا۔

اپنے گھر کے سامنے پہونچتے ہی جیون کا دل کسی خوفناک خیال کے ڈر سے کانپ اٹھا۔ اسکے گھر کے دروازہ پر زمیندار کا کارندہ کھڑا ہوا تھا۔ جیون کا خوشیوں بھرا گیت اچانک رک گیا۔ بے زبان جانور نے بھی گویا اپنے مالک کے دل کا بھید بھانپ لیا —— اس کی چال دھیمی پڑ گئی۔

اسی وقت کارندہ نے آگے بڑھ کر حکم دیا —— "جیون چلو۔ تمہیں زمیندار نے یاد کیا ہے"۔

"بھائی صاحب" کہہ کر جیون نے بڑی نرم آواز میں پوچھا۔ "کچھ معلوم ہے کہ مجھے مالک نے کیوں بلایا ہے؟"

کارندہ نے لاپرواہی سے جواب دیا —— "نہیں، مجھے کیا معلوم"۔

جیون زمیندار کے پاس پہونچا۔ زمیندار لکھپت رائے اپنے مکان کے صحن میں آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا جیون نے قریب پہونچ کر اسے جھک کر بندگی کی لکھپت رائے نے مسکرا کر کہا —— "جیون۔ نمائش کی جیت مبارک"۔

جیون کا دل کانپ گیا "یہ طعنہ ہے یا مبارک باد" اس نے آہستہ سے صرف اتنا ہی کہا —— "یہ حضور کی مہربانی ہے"۔

پھر زمیندار نے معنی خیز طریقہ سے دیکھ کر کہا —— "جیون۔ میں واقعی تمہارے بیل کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ میں اسے تم سے خرید لینا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ بیل تمہارے یہاں بالکل بیکار رہتا ہے۔

اس لئے مجھے امید ہے کہ اُسے بیچنے میں تم نیس و پیش نہ کرو گے۔"

جیون سہم گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زمیندار نے کہا— "بولو۔ چپ کیوں ہو"

جیون نے ڈرتے ڈرتے کہا— "حضور آپ کے پاس جانوروں کی کیا کمی ہے۔ میں اس بیل کو بیچنا نہیں چاہتا"۔

"تمہیں اس کے بدلے مُنہ مانگے دام ملیں گے"۔

"میں اسے کسی بھی دام پر بیچنا نہیں چاہتا۔ حضور، میں خود بھی تو آپکی جائداد ہوں"۔

زمیندار نے اب لالچ دینی شروع کی— "تمہارا لگان معاف کردونگا"۔

جیون نے مُنہ توڑ جواب دیا۔

زمیندار اس پر بھی نا اُمید نہیں ہوا۔ اب اس نے اپنی قوت کا استعمال کرنا شروع کیا— "تمہیں یہ بیل بیچ دینا ہوگا"۔

جیون چپ رہا۔

زمیندار نے پھر کہا— "سیدھی طرح سے نہیں دوگے تو پھر اور کسی ترکیب سے دوگے"۔

جیون کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "ہرگز نہیں"۔

زمیندار نے کہا— "اچھا جاؤ"۔

اس دن کے بعد سے بدنصیب جیون پر سختی کرنی شروع کی۔ اس سے کٹھن بے گار لی جانے لگی۔ بیگار ایسی لی جاتی تھی کہ گورا کو دن رات کام میں لگا رہنا پڑے کبھی کبھی اکیلے گورا کو ہی بے گار میں

مانگ لیا جاتا تھا۔ جیون کی بدنصیب زندگی پر یہ ایک نئی آفت کھڑی ہوئی لیکن پھر بھی جیون نے ہار نہیں مانی۔ اپنی قسمت کے بھروسے جیون یہ سارے ظلم سہتا گیا۔

(۴)

جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر گاؤں کی طرف لوٹتے ہوئے جیون کانپ اٹھا۔ آسمان اچانک کالے کالے بادلوں سے گھر گیا تھا۔ جیون کو جس بات کا خوف تھا آخر وہی ہوئی۔ ان برسات کے دنوں میں گاؤں سے تین چار میل دور اور ایک برساتی نالہ پار کر کے لکڑیاں کاٹنے جانا حقیقت میں خطرناک کام تھا۔ برسات کی وجہ سے نالے کا کوئی بھروسہ نہیں تھا وہ نہ جانے کب بھر کر بہنے لگے۔ زمیندار لکھپت رائے نے جیون کو اس جنگل سے بے گار میں لکڑیاں کاٹ کر لانے کا حکم دیا تھا۔ جیون جب گھر سے چلا۔ تب آسمان صاف تھا۔ اور نالے میں پانی کم تھا۔ مغرب کے وقت جونہی گاڑی میں لکڑیاں بھر کر وہ لوٹنے کو تیار ہوا اندر دیوتا کی فوج نے ایک ساتھ آسمانوں پر چڑھائی کر دی۔

جیون نے "راس" ہلا کر گورے کو بھاگنے کا اشارہ کیا۔ برساتی نالہ اس جگہ سے چار پانچ ہی فرلانگ تھا۔ جیون کی کوشش تھی کہ کسی طرح بھاگ کر گاڑی سمیت اس نالہ کے پار پہونچ جائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا۔ لیکن اسوقت تک بارش بڑے زور سے شروع ہو گئی تھی نالے کے ریتیلے کنارے پر پہونچتے پہونچتے جیون نے بڑے دکھ کے ساتھ دیکھا کہ نالہ خوب بھر کر بہہ رہا ہے۔ جیون نا اُمید ہو گیا۔ اب کئی گھنٹوں تک

اُسی گاڑی پر بیٹھے رہنے کے لئے وہ مجبور تھا۔ بارش کی بوچھار جیون کے جسم پر بے تحاشہ پڑ رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اُترا۔ اُس نے گورا کو گاڑی سے کھول کر کنارے ہری ہری گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اس کے بعد گاڑی میں کی لکڑیوں کو اس نے کچھ اس ڈھنگ سے رکھا کہ اُن کے اندر ایک کھوہ سی بن گئی۔ اس کھوہ کے اوپر اپنی پھٹی پُرانی چادر ڈال کر برسات سے بچنے کے لئے جیون اندر بیٹھ گیا۔

اچانک گردن اُٹھا کر "گورا" بڑی زور سے گرج اُٹھا۔ گورا کی یہ گرج سُن کر جیون خوف سے کانپ اُٹھا۔ دُھڑکتے ہوئے دل سے اُس نے اپنی کھوہ سے سر باہر نکالا۔ دیکھا گورا اب بھی پہلے ہی کی طرح اطمینان سے ہری ہری گھاس چر رہا ہے۔ بارش اس وقت بھی کم نہیں ہوئی۔ نالہ کے مٹیالے پانی میں بارش کی بڑی بڑی بوندیں اسے ہراسان کر رہی تھیں اسے ایسا معلوم ہوتا گویا ان بوندوں کی مار سے وہ نالہ بوکھلا سا گیا ہے جیون نے جنگل کی طرف مڑ کر دیکھا —— چاروں طرف ہُو کا عالم ہے۔ صرف بارش کی سائیں سائیں کی آواز اس خاموشی کو توڑ رہی ہے۔ جنگل کے ہرے بھرے درخت بارش میں ایک ساتھ چپ چاپ نہا رہے ہیں۔ جیون نے پھر سے اپنا سر کھوہ میں چھپا لیا۔ اس خوف ناک سناٹے میں اسے کچھ خوف سا معلوم ہونے لگا۔

تھوڑی دیر میں بادل پھٹ گئے۔ بارش تھم گئی۔ قوس قزح پچھم میں لہرانے لگی۔ سورج ڈوبنے میں اب زیادہ وقت نہیں تھا۔ سورج کی آخری کرنوں نے بادلوں میں رنگا رنگ کے نقوش کھینچ دیئے تھے۔ ان کے

عکس سے برساتی نالے کا پانی بھی پگھلے ہوئے سونے کی زرّیں دھار کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جنگل میں مور بولنے لگے۔ خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ چاروں طرف جنگل بہشت منظر بن گیا لیکن بے گار میں پکڑے ہوئے جیون کو ان دلفریب مناظر کا خیال نہیں تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے نالے کا پانی کم ہو جانے کا انتظار کر رہا تھا۔

آہستہ آہستہ نالے کا پانی بھی اتر گیا۔ جیون کی اب جان میں جان آگئی۔ گورا کو گاڑی میں جوت کر وہ پھر سے اپنی کھوہ میں آبیٹھا۔ اور رسی ہلا کر گورا کو چلنے کا اشارہ۔ سامنے سورج غروب ہو رہا تھا۔

کنارے کے اس پرے میدان سے اتر کر گورا نالے کے ریتیلے بازو پر پہونچا لیکن پانی کے قریب پہونچتے ہی وہ کسی چیز کو دیکھ کر اچانک بھچک گیا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ گاڑی رک گئی جیون پھر سے کانپ اٹھا ڈرتے ڈرتے کھوہ میں سے اس نے اپنا منہ باہر نکالا۔ نالہ کی طرف دیکھتے ہی اس کے ہوش گم ہو گئے۔ اس نے دیکھا جنوب کی طرف گاڑی سے بیس ہی گز کے فاصلہ ایک بڑا سا شیر کھڑا ہے۔ اور گاڑی کی طرف دیکھ کر غرّا رہا ہے۔

دوسرے ہی پل شیر بڑی زور سے گرج اٹھا اس کی گرج قریب والی پہاڑی سے ٹکرا کر گونج اٹھی۔ قریب کے جنگل میں پھر سے سناٹا چھا گیا۔

جیون اسی طرح گھبرائی ہوئی نظر سے شیر کو دیکھتا رہا۔ لیکن شیر ابھی تک [illegible]

جسم کو دیکھ کر ہی غرّا رہا تھا۔ شیر کی غضبناک گرج سن کر گورا تھرّا گیا۔ وہ بڑی دردناک آواز میں چلایا "ہان ——— ہاں"

اس وقت شیر آہستہ آہستہ بڑی شان سے قدم بڑھاتا ہوا گورا کیطرف بڑھا۔ جیون اس وقت بھی کھوہ سے گردن باھر نکالے شیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ اب بھی چاہتا تو کھوہ میں چھپ کر اپنی جان بچا سکتا تھا شیر کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر وہ مظلوم جانور بہت ہی دردناک آواز میں چلایا "ہاں ——— ہاں"

گورا کی درد بھری آواز سن کر جیون ایک دم بیکل ہو اٹھا۔ ماضی کا ایک واقعہ اس کی نظروں میں پھر گیا ——— آج سے دو سال پہلے گورا کی یہی درد بھری "ہاں ——— ہاں" سن کر اس نے گیدڑ والے سے اس کی جان بچائی تھی۔ کیا آج وہ اسے شیر کے منہ سے نہیں بچا سکتا؟

جیون کود کر گورا کی پیٹھ سے لپٹ گیا۔ اسی لمحہ وہ شیر ایک بار پھر بڑی زور سے گرج کر گورا پر جھپٹا۔ لیکن اس کے تیز ناخن گورا کے بھرے ہوئے جسم میں دھنسنے کی بجائے جیون کے سوکھے ہوئے پیٹ میں جا دھنسے۔

شیر نے اس شکار کو غنیمت سمجھا۔ وہ بدنصیب لیکن دلیر جیون کی لاش کو لے کر جنگل میں غائب ہو گیا۔

دوسرے دن علی الصبّاح جیون کے رشتہ دار اسے ڈھونڈھتے ہوئے وہاں پہونچے۔ گورا اب بھی اسی طرح سہما ہوا کھڑا ہوا تھا۔ گاڑی کی کھوہ کے اوپر جیون کی میلی چادر بھی اسی طرح پھیلی ہوئی تھی۔

گورا کے پیٹ پر خون کے بڑے بڑے دھبے اور ریت پر شیر کے پنجوں کے بڑے بڑے نشان دیکھ کر انھیں اس مصیبت کا حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

جیون کی قربانی آس پاس کے سب گاؤں میں بہت مشہور رہی لوگ اس کا نام بڑی عزت سے لیتے ہیں۔ گورا آج بھی زندہ ہے لیکن اب وہ اتنا مضبوط نہیں رہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ مالک کے غم میں وہ دن دن گھلتا چلا جا رہا ہے۔ لکھپت رائے بھی اپنے کرتوت پر شرمندہ ہیں اس دن کے بعد سے پھر کبھی انھوں نے گورا کے لئے ظلم نہیں کیا ⁂ ⁂

ردھیا

پوس کا جاڑا تھا اور چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کہر کے دبیز پردے میں آسمان چھپ گیا تھا۔ گنگا کے اس پار بادلوں کا ایک شہر بسا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ چاند بادلوں کے حسین آنچل میں ڈوب کر سو گیا تھا۔

گنگا کے کنارے سیڑھیوں سے نیچے سینکڑوں بھکاری ٹھٹک کر گٹھری بنے ہوئے پڑے تھے ان میں کوئی لنگڑا تھا۔ کوئی لولا۔ کوئی اندھا تھا تو کوئی ہاتھ پاؤں سے معذور۔ کوئی سردی سے کھانس رہا تھا۔ اور کوئی دمہ سے بے حال تھا کسی کو بخار تھا تو کوئی بے ہوش معلوم ہوتا تھا کہیں کہیں سے آہ۔ آہ کی آواز سنائی دیتی تھی تو کہیں سے چیخ پکار۔ یہاں دکھی دنیا کے مالداروں کی چتا تھی۔

کنارے کے اس پار کی عمارتیں آسمانوں کو چھو رہی تھیں۔ جن میں آسودہ حال متوالے چین کی نیند سو رہے تھے۔ کہیں سے ستار کی میٹھی میٹھی جھنکار آ رہی تھی، تو کہیں سے پیانو اور ہارمونیم کی سُریلی تان کہیں کہیں سے بانسری کا جادو بھرا نغمہ دلوں میں گدگدی پیدا کر دیتا تھا۔ ان مست ہواؤں کی چنچل لہروں میں کسی کی مسرت آمیز موسیقی بہا کرتی تو کسی کی درد بھری آہیں بھی سنائی دے رہی تھیں

وہیں ایک بوڑھیا پیڑ کے نیچے ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ سو رہی تھی چیتھڑے ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ بوڑھیا اندھی تھی بچی پر اس کی بڑی ممتا تھی۔ وہی اس کی زندگی کا ہیرا موتی تھی۔

بوڑھیا نے کہا——

"رودھیا! تجھے نیند نہیں آتی۔ کیا جاڑا لگتا ہے۔ آ۔ میرے کلیجے سے لگ کر سو جا"

رودھیا بولی——

"نہیں نانی! جاڑا تو نہیں لگتا۔ ایک بات ہے۔ آج مجھے چار پیسے مل گئے"۔

"وہ کیسے"

"آج ایک راجہ گنگا پر نہانے آئے۔ ان کے ساتھ رانی بھی ان کے جسم پر قیمتی قیمتی گہنے جگمگا رہے تھے۔ انھیں کے نوکر نے مجھے چار پیسے دیئے۔ اچھا نانی ایک بات بتاؤ گی"۔

"کیا بات ہے بیٹی"

"رانی کو اتنا گہنا کہاں سے مل گیا نانی"

"انھیں ایشور نے دیا ہے بیٹی"

"تو ایشور ہم لوگوں کو کیوں نہیں دیتا"

"ایشور غریبوں کو نہیں دیتا"

"کیوں"

"اس لئے کہ جب دنیا میں سب ہی مالدار ہو جائیں تو پھر غریب

نہ رہیں گے۔ اور نہ خیر خیرات کے نیک کام ہی باقی رہ جائیں گے۔"

رودھیا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ بار بار یہی سوچتی تھی کہ رانی کے ہاتھ کا کڑا کتنا چمک دار تھا۔

بوڑھیا نے کہا ——

"بیٹی اب سو جا —— بہت رات بیت گئی۔"

—— (۲) ——

رودھیا کی عمر ابھی چھ سال کی ہو گی کہ اس کی ماں اُسے دُکھ بھری دنیا میں تنہا چھوڑ کر چل بسی۔ بوڑھیا نے بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر اُسے پالا پوسا۔ اور بڑا کیا۔ اب وہ بھیک مانگنے جاتی تو ساتھ رودھیا کو بھی لے جاتی۔ رودھیا اندھی کی لاٹھی تھی۔ اسے پا کر بوڑھیا اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھتی۔

رودھیا دن بدن بڑھتی گئی۔

——————

بوڑھیا بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اب وہ بھیک مانگنے بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس میں چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ رودھیا جو کچھ مانگ کر لاتی اس سے دونوں کی بسر ہوتی تھی۔ وہ بڑی محبت سے اپنی نانی کو دن بھر کے واقعات سناتی۔ ایک بچے کو جس طرح اپنے پیارے کھلونے سے محبت ہوتی ہے اس سے کہیں زیادہ رودھیا کو اس بوڑھیا سے محبت تھی۔

—— (۳) ——

عرصہ گذر گیا ——

ایک دن اس نے دیکھا کہ بوڑھیا کا جسم بخار کی گرمی سے دہک رہا ہے۔ اس کے روئیں روئیں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں بیچاری رہ رہ کر کراہ اٹھتی تھی۔

روھیا نے کہا۔

"نانی — یہ بخار تو چولہے کی آگ سے بھی زیادہ تیز ہوتا جا رہا ہے۔ اچھا۔ جاتی ہوں۔ شاید دودھ کے لئے کہیں سے چار پیسے مل جائیں"۔

روھیا دن بھر راستہ میں بھٹکتی رہی۔ اسے کہیں کچھ نہ ملا۔ اسے جو دیکھتا کہتا ——

"چھی! اتنی بڑی ہو کر بھیک مانگتی ہے۔ ایشور نے ہاتھ پیر دیئے ہیں جا — کہیں نوکری کر لے"

اکثر لوگ اس سے دل لگی کرتے

آخر بیچاری تھکان سے چور ہو کر لوٹ آئی۔ اب اسے بھیک مانگتے ڈر ہوتا تھا۔

بوڑھیا نے ہلتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"بیٹی آج کیا ملا —"

"کچھ بھی نہیں نانی! لوگ کہتے ہیں —— اتنی بڑی لڑکی ہو کر بھیک مانگتی ہے۔ جا۔ نوکری کر لے"

بوڑھیا نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا ——

"ہاں بیٹی تو نوکری کر۔ میں بھی جاتی ہوں۔ میری نوکری پوری ہو چکی"

"کہاں نانی"

"یہاں کی نوکری سے جی بھر گیا - اب وہاں کی نوکری کرنے جاتی ہوں"

رودھیا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا -

اس نے کئی بار پوچھا ——— "کہاں نانی" لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا -

گنوار

بھری بھری شام کا وقت تھا۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں ہرے بھرے کھیتوں پر تھرک رہی تھیں۔ اس وقت منگل پور گاؤں کے زمیندار پنڈت راما وجن پھاٹک ہوا خوری کے لئے نکلے۔ پھاٹک جی کی عمر ۴۴-۴۵ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ پست قد لیکن گٹھے ہوئے جسم کے آدمی تھے۔ رنگ گیہواں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور چمک دار۔ چھوٹی مونچھیں۔ گردن پر گلوبند۔ جسم پر کوٹ۔ دھوتی۔ سر پر اونی فولڈنگ ٹوپی۔ پیروں میں فل سلیپر۔ ہاتھ میں بانس کا موٹا ڈنڈا۔ پھاٹک جی کے پیچھے پیچھے ایک بوڑھا دیہاتی کندھے پر بھی لاٹھی رکھے اپنے دیہاتی جوتوں سے چرچر کی آواز کرتا ہوا چل رہا تھا۔ گھومتے گھومتے پھاٹک جی کھیتوں کے قریب آم اور مہوہ کے درختوں سے گھری ہوئی زمین پر پہنچے۔ اس زمین پر ایک بڑا کنواں تھا جس سے کھیت سینچنے کا کام لیا جاتا تھا۔ کنویں سے ہٹ کر پاس ہی ایک پھوس کی جھونپڑی۔ جھونپڑی کے سامنے دھونی لگی ہوئی تھی۔

پھاٹک جی کے اس جگہ پہنچتے ہی کچھ دور کھیتوں کی مینڈھ پر سے لپک کر آتا ہوا ایک بڈھا کسان دکھائی دیا۔ بڈھے کسان کو دیکھ کر اس نے پھاٹک جی سے کہا۔

—— "بیجو ناتھ کاکا آرہے ہیں"۔

پھاٹک جی نے صرف "ہوں" کہہ کر کسان کی بات کا جواب دیا۔ شیو ناتھ کا کا جب پھاٹک جی کے قریب پہونچے تو بولے —— "پال آگن پنڈت جی" پھاٹک جی نے مسکرا کر کہا —— "خوش رہو۔ کاہے کو دوڑ آئے ٹھاکر۔ اپنا کام کیا ہوتا"۔

"کون کام ہے۔ مالک تو کبھی کبھی آجاتے ہیں۔ کام تو لگا ہی رہتا ہے۔ سرکار روز روز تھوڑا ہی آتے ہیں"۔ یہ کہتا ہوا بوڑھا کسان لپک کر اپنی جھونپڑی میں گیا اور ایک چھوٹی سی چارپائی نکال لایا کھلی جگہ میں چارپائی بچھا کر بولا —— "آؤ سرکار۔ تھوڑا سستا لو"۔

"تم تو بڑی تکلیف اٹھاتے ہو ٹھاکر"

"تکلیف کس بات کی نمبردار۔ سردار کے درشن ہو گئے۔ سکھ ملا۔ تکلیف کا کون کام"

پھاٹک جی چارپائی پر بیٹھ گئے اور چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولے ——

"—— تمہاری کھیتی تو اچھی ہے ٹھاکر۔ تم محنت بھی تو بہت کرتے ہو"

کسان بول اٹھا "چار آدمیوں کا کام یہ اکیلے کرتے ہیں مالک۔ گاؤں کو چھوڑ کے یہاں جنگل میں پڑے رہتے ہیں"۔

"ہاں بھئی شیو ناتھ سنگھ تم گاؤں میں کیوں نہیں رہتے"؟

"بستی میں دل نہیں لگتا سرکار۔ ہمیں یہیں اچھا لگتا ہے۔ لڑکے بہت ضد کرتے ہیں کہ گھر چل کر رہو۔ مگر ہمارا وہاں دل ہی نہیں لگتا۔ گھر میں بہو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اندر جاؤ تو کھانس کر جاؤ۔

بہو بیٹیاں گھونگٹ سنبھال کر الگ پریشان ہو جاتی ہیں - اس سے یہیں اچھا ہے - چاہے ننگے پڑے رہو کوئی ھرج نہیں۔"

"جب سے ان کی گھروالی مری ہے اس وقت سے یہیں رہنے لگے ہیں - گھروالی کے مرنے کے بعد شاید ہی چار پانچ مہینے گھر پہ رہے ہوں ۔۔۔۔کیوں کاکا"

کسان نے کہا۔

"ہاں چھ مہینے رہے تھے۔"

"تیج تہوار کے دن گاؤں جاتے ہیں - وہ بھی ذرا دیر کو"

"تمہیں یہاں ڈر نہیں لگتا؟"

"کون ڈر ہے - یہاں دھرا ہی کیا ہے - باگ بھیڑیے یہاں ہیں نہیں پھر ڈر کا ھے کا"

"بھوت پریت کا"

"ارے سرکار - ہم خود بھوت ہو رہے ہیں - بھوت ہمارا کیا کر سکتا ہے - ایک دن ھنگرو رات میں ادھر سے گاؤں کی طرف جا رہا تھا - ہم کھیت سے ادھر آرہے تھے - اندھیرا تھا - تو ہمیں دیکھ کر سرکار وہ بھاگا - ہم سمجھے کوئی چور ہے - ہم نے للکارا۔۔۔۔تو وہ اور بھی جان لے کر بھاگا - دوسرے دن آکر ہم سے بولا۔۔۔۔وہ کاکا تم تھے - ہمیں نہ معلوم تھا - ہم تو کل ڈر گئے کہ نہ جانے کون بلا ہے - تو سرکار یہاں تو ہم ھی بھوت پریت ہیں"۔

پھاٹک جی ہنستے ہوئے بولے۔۔۔۔"بات تو ٹھیک کہتے ہیں"

اُسی وقت ایک ۲۰ - ۲۴ برس کا نوجوان پیتل کی تھالی کپڑے سے ڈھکی ہوئی لے کر آیا شیوناتھ سنگھ بولا —— "جاؤ بیٹا - اندر رکھ کر ڈھانک آؤ - اوپر سے تسلہ رکھ دینا"۔

"کھانا گھر ہی سے آتا ہے"

"ہاں —— اس بکھت پراٹھے بن کر آجاتے ہیں۔" شیوناتھ سنگھ نے کہا

"اور سویرے"

"سویرے کبھی یہیں روٹی دال بنا لیتے ہیں کبھی گڑ کھا کر رہ جاتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں تو نہیں بناتے - گڑ کھا لیا ستو پھانک لیا - اب کون کھانا سرکار پیٹ بھرنا ہے - آپ کی جوتیوں کی برکت سے بہت کھایا پیا۔ اب یہ لڑکے کھائیں ہمیں تو پیٹ بھرنے سے مطلب ہے"۔

نوجوان تھالی جھونپڑی میں رکھ کر باہر آگیا تھا - وہ بولا ——

"ہم تو بہت کہتے ہیں سرکار کہ گھر پہ رہو - مگر یہ مانتے ہی نہیں"

"گھر پہ کیا رہیں؟ کیا دھرا ہے - گھر پہ - کوئی بات کرنے والا بھی تو ہو - بہو بیٹیاں بیچاری اور پریشان رہتی ہیں - کھل کر اٹھنے بیٹھنے نہیں پاتیں ہم بھی بندھے سے رہتے ہیں - یہاں رہنے سے ہمیں بھی آرام ہے —— یہ اچھا —— یا وہاں رہ کر تکلیف اٹھانا اچھا"۔

"اور بھی سب لوگ رہتے ہیں یا تمہیں - وہ سب کیسے رہتے ہیں"۔ نوجوان نے کہا۔

—— "رہتے ہوں گے - انھیں اچھا لگتا ہے —— رہتے ہیں ہمیں اچھا نہیں لگتا - اب سرکار انھیں ہمارے یہاں رہنے سے اتنی پریشانی ہے کہ یہاں اس بکھت کھانا پہونچانا پڑتا ہے —— بس اتنی سی بات کے لئے یہ ہمیں

وہاں رکھنا چاہتے ہیں"

"ہمیں کون پریشانی ہے ——— ہکّا کہو تو دن میں چار دفعہ آویں جاویں اور آتے جاتے ہی ہیں۔ گھر میں تھوڑا ہی پڑے رہتے ہیں۔ کام تو نہیں ہے" نوجوان نے جواب دیا۔

کسان نے کہا ——— "دیکھو بھیا۔ ایک بات تو ہم بھی کہیں گے۔ کاکا کے یہاں رہنے سے تمہاری کھیتی گاؤں پہ بھاری رہتی ہے۔ اتنا گلا سرکار گاؤں میں کسی کے کھیتوں میں نہیں ہوتا جتنا کہ ان کے کھیتوں میں ہوتا ہے۔ سو بات کیا ہے۔ کاکا یہاں ہر گھڑی موجود رہتے ہیں۔ کیا مجال جو گھانس کی کاڑی بھی کھیتوں میں جم جائے۔ ہر بکت کھرپی لئے گھوما کرتے ہیں۔ رات بھر میں چار دفعہ اُٹھ کر چکر لگاتے ہیں"

"ارے میکو بھیّا۔ تب بھی نکسان ہو ہی جاتا ہے۔ پرسوں سُوّر ہماری سکرکند کھا گیے۔ ایسا رنج ہوا کہ کیا کہیں۔ کہاں تک پہرہ دیں۔ سوّر و نکے مارے ناک میں دم ہے۔ ہمارے مالک برھمن ٹھہرے نا ——— سکار کرتے نہیں۔ نہیں تو بندوک ہے ہی۔ کسی دن رات میں یہاں بیٹھ جائیں اور دو ایک کو لُڑکا دیں۔ بس پھر نہ آویں۔ آدھا بیگھا سکرکند کھود کر کھا گئے"

"تو سکرکند کھد والو۔ اب تو کھدوائے کا بکت آگیا" کسان بولا۔

"ہاں اب سینچائی سے چھٹی پائی ہے۔ کل پرسوں کھدوائی لگائیں"

پھاٹک جی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے ——— "اچھا اب چلیں گے کٹا کر"

"اچھا مالک کبھی کبھی درسن دے جایا کرو ——— دو چار برس کے مہمان اور ہیں"

"تو کاکا ابھی تم بہت جیو گے" میکو بولا۔

"ارے بھیّا - اب کون بھروسہ - جب تک چلتے ہیں چلتے ہیں چرن چھوئیں پنڈت" "خوش رہو" کہہ کر پھاٹک جی چلدیئے۔

کچھ دور چل کر میکو پھاٹک جی سے بولا — "بڑا محنتی بوڑھا ہے۔ دن رات بھوت کی طرح جُتا رہتا ہے۔ اسی کے بل پر اتنی بڑی کھیتی چل رہی ہے"۔

"اور بات کا بڑا کھرا ہے۔ لگان سب سے پہلے جمع کر دیتا ہے"

"ہاں سرکار۔ یہ بات تو ہے۔ پرایا پیسہ کبھی نہیں رکھتا۔ اور آمدنی بھی تو ہے۔ سینکڑوں روپیہ سال کی پیداوار ہوتی ہے"

"آمدنی سے کیا ہوتا ہے۔ گاؤں میں اور بھی تو آمدنی والے ہیں۔ مگر پرایا پیسہ دیتے دم نکلتا ہے۔ یہ تو نیت کی بات ہے۔ ٹھاکر نیت کا بڑا صاف ہے" پھاٹک جی نے کہا۔

"ہاں سرکار نیت کی تو بات ہی ہے"۔

(۲)

شیوناتھ سنگھ کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑا وہی تھا جو کھانا لے کر آیا تھا۔ اس کا نام ارجن سنگھ تھا۔ ارجن سنگھ سے چھوٹا نرنجن سنگھ جس کی عمر بائیس برس کے لگ بھگ تھی۔ سب سے چھوٹا شنکر سنگھ تھا۔ شنکر سنگھ کی عمر کوئی اٹھارہ برس کی ہوگی۔ شیوناتھ سنگھ کے بڑے بھائی کا بھی خاندان تھا۔ جن کا رہنا کھیتی باڑی سب ملے ہوئے تھے۔ اس خاندان میں صرف ایک لڑکا سندر سنگھ بائیس تئیس کی عمر کا تھا۔ اس کی ماں اور بیوی بھی تھی۔ سندر سنگھ کو ایک چار برس کا لڑکا تھا۔

اور ایک دو سال کی لڑکی ۔ سندر سنگھ کی شیوناتھ سنگھ سے دشمنی تھی ۔ کیونکہ شیوناتھ سنگھ دولتمند تھا ۔ اور سکھ چین سے زندگی بسر کرتا تھا ۔ اگرچہ سندر سنگھ کے پاس بھی کھانے کمانے کے لئے کافی زمین تھی ۔ لیکن اپنی بری عادتوں اور لاپرواہی کے سبب اس کی معاشی حالت ہمیشہ خراب رہی ۔ شیوناتھ سنگھ نے سندر سنگھ کو سیدھے راستہ پر لانے کے لئے بڑی بڑی کوششیں کیں ۔ جب انھیں کامیابی نہ ہوئی تو وہ اس کی طرف سے ناامید ہو گئے ۔

رات ہو چکی تھی ۔ سندر سنگھ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے دروازہ سے لگے ہوئے الاؤ پر بیٹھا تھا ۔ آگ کے چاروں طرف گاؤں کے تین چار من چلے نوجوان بیٹھے تھے ۔ ایک کہہ رہا تھا "اب کی تو تمہاری کھیتی بگڑ گئی سندر" "کیا بتائیں ۔ وقت پر پانی نہیں دیا گیا ۔ اس سے ہلکی پڑ گئی ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ کھیتی میں ہمارا دل نہیں لگتا ۔ کھیتی کرنے والا آدمی آدمی نہیں رہتا جانور بن جاتا ہے ۔ ہمارے کاکا ہی کو دیکھ لو انھیں آدمی کون کہے گا ۔ اس دن مہنگرو کو رات کے وقت انھیں دیکھ کر بھوت پریت کا ڈر ہو گیا تھا" ۔ "کھیتی میں تو یار ہمارا بھی دل نہیں لگتا ۔ مگر کیا کریں ۔ مزہ تو شہر میں رہنے میں ہے ۔ شام کو نکلے تو ہر طرف چمن دکھائی دیتا ہے بجلی کی روشنی جگمگ جگمگ ہوتی ہے ۔ سینما دیکھو ۔ بازار گھومو ۔ اس دن ہم شہر گئے تھے سینما بھی دیکھا تھا طبیعت بڑی خوش ہوئی ۔ کہا بھی تو ہے "شہر میں دیوتا رہتے ہیں" ایک نوجوان بولا اور بھی تو کہاوت ہے "بستی کے رہنے والے ہی انسان ہوتے ہیں اور جنگل کے رہنے والے بھوت" دوسرا بولا جیسے ہمارے کاکا ۔

وہ مرکے بھوت ہی ہوں گے۔" سندر نے کہا۔

سب لوگ خوب ہنسے۔ انسان اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی چیز کو مذاق کا ذریعہ بنا لیتا ہے۔

"کہاوت تو ٹھیک ہے۔ دیہات کی زندگی بھی کوئی جینے میں جینا ہے۔"

"لیکن بھیا کیا کیا جائے سہر میں رہنے کے لئے پیسہ چاہیئے۔"

"ہاں بھیا سندر سے کہتے ہیں کہ سہر میں چل کے رہو۔ وہیں پر روزگار کریں۔ یہاں تو وہی صبح سام ہے وہی ہل بیل اور وہی کھیت دن بھر کھیتوں میں کام کرو۔ سام کو گھر آکر کھاؤ پیو اور سو جاؤ۔ اس بکت سہر میں کیسی بہار ہو گی۔ یہاں تو ابھی سے الّو اور گیدڑ بولنے لگے۔"

"یار کیا بتائیں۔ ہماری تو بڑی کھواہس ہے مگر اس بکت پیسے سے مجبور ہیں۔"

"دو چار سو اپنے کاکا سے لے لو کبھی دے دینا۔"

"کاکا ایک دھیلا دینے والا نہیں۔"

"کاہے نہیں دے گا۔ اپنے کھیت انھیں دے دو تب تو دے گا۔"

"ہاں بھیا یہ تو سنکر بھیا نے ٹھیک کہا۔ کھیت دیدیں گے تو پیسے ضرور ملیں گے۔"

"کھیتوں پر دوسرا بھی دیدے گا۔ کاکا نہ دیں تو نہ دیں۔"

سندر کچھ دیر تک سوچ کر بولا "ہاں بھیا یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ کھیتوں پر تو روپیہ مل جائے گا۔"

"کہو دوست کیسی سوجھی؟ نہ کہو گے۔ اچھا تو کل سے کوسس سروع کرو۔"

"سہر میں روزگار کیا کریں گے۔ یہ بھی تو سوچ لو۔"

"ارے بھیا روزگار کی کمی ہے! موہن کو دیکھو گاؤں سے چلا گیا سہر میں جا کر پان کی دوکان کھولی دھیرے دھیرے دوکان جم گئی۔ آج کل دو تین روپے روز کما لیتا ہے۔ دوکان ٹھاٹھ کی ہے۔ بجلی لگی ہے۔ دو بڑے بڑے گولے جل رہے ہیں۔ بن سنور کر چھیلا بنا بیٹھا رہتا ہے۔ ہم جب کبھی سہر جاتے ہیں تو ایسا بڑھیا پان کھلاتا ہے کہ طبیعت تر ہو جاتی ہے"

"اور جب یہاں رہتا تھا تو انگل بھر دھول جسم پر جمی رہتی تھی"

"دیہات میں دھول ہی تو ہے"

اس طرح یہ منچلے دیہاتی نوجوان شیخی بگھارتے رہے۔ دوسرے دن سندر سنگھ شیو ناتھ سنگھ کے پاس پہونچا۔

"کاکا چرن چھوؤں" یہ کہہ کر سندر سنگھ کھڑا ہو گیا۔ شیو ناتھ سنگھ محبت سے بولا "آنند رہو بیٹا۔ کہو کیسے"

"کاکا آپ سے کچھ کام تھا"

"کہو بیٹا"

"کاکا دیہات میں جی نہیں لگتا۔ سہر جانا چاہتے ہیں"

"سہر" شیو ناتھ نے کہا

"ہاں سہر میں کوئی روزگار کریں گے"

"کاہے بیٹا یہ کیوں۔ گھر آیا ناگ نہ پوجے بانبی پوجن جائے۔ گھر کا روزگار چھوڑ کے سہر میں روزگار کیوں کروگے"

"یہاں کون روزگار ہے کاکا۔ خالی کھیتی ہے تو اس میں ہمارا دل نہیں لگتا"

"کاہے دل نہیں لگتا۔ اوتم کھیتی مدھیم بان اوتم کام چھوڑ کر مدھیم کام کرو گے"
"کھیتی چاہے اتم ہو چاہے مدھیم۔ ہمارے دل پر نہیں چلتی"
"کھیتی میں محنت پڑتی ہے اس سے"
"روزگار میں بھی تو محنت پڑتی ہے۔ روزگار کچھ بے محنت تھوڑا ہی ہو جاتا ہے"
"روزگار میں گدی تکیئے کی بیٹھک ملتی ہے۔ کھیتی میں دھول میں بیٹھنا پڑتا ہے"
"یہ بات نہیں ہے کاکا۔ نہ ہم محنت سے ڈرتے ہیں نہ دھول میں لوٹنے سے بات یہ ہے کہ ہمارا دل نہیں لگتا۔"
"خیر بیٹا جو تمہارے دل میں آئے سو کرو اور تم نے ہمیشہ ایسا ہی کیا ہے۔ ہماری بات تم نے کب مانی ہے۔ گھر بیٹھے کا روزگار چھوڑے پردیس میں جائے پڑو گے۔ تمہاری مرجی"
"ہاں کاکا اب تو ایسی ہی مرجی ہے۔ موہن بھی تو سہر چلا گیا تھا۔ آج اس کی کیا حالت ہے۔ پان کی دوکان سے دو تین روپے روز پیدا کر لیتا ہے۔ اچھا کھاتا ہے اچھا پہنتا ہے"
کاکا ہنس پڑے۔ بولے "اچھا کھاتا ہے اچھا پہنتا ہے۔ ہاں گھی کے نام پر سڑے گھاس کا گھی۔ دودھ کے نام سے پانی۔ مکھن کی مٹھائی تو دیکھ بھی نہیں پاتا۔ یہی اچھا کھانا ہے۔ رہی پہننے کی بات۔ پہن تو تم یہاں بھی سکتے ہو۔ کپڑا لے آؤ۔ سلا لو"
"کچھ بھی ہو۔ مگر یہاں سے سکھی ہی ہے۔ اور یہاں اچھا پہن کے کریں کیا دھول کھلاویں"
"ہاں یہ بات تو بیٹا ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا پہن کر بازاری عورتوں کو

بتانے کا ڈھنگ تو یہاں نہیں"

"موہن کو جب یہاں روزگار نہیں ملا تو بے چارہ گیا"

شیو ناتھ سنگھ جھنجلا کر بولا" موہن کی تمہاری برابری۔ موہن کے پاس زمین تھی کہاں؟ اس لئے اس کا جانا ٹھیک ہی تھا۔ تمہارے تو رام جی کی مہربانی سے اتنی زمین ہے کہ چار کو کھلا کے کھا سکتے ہو۔ لیکن محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ جو چاہے کہ گھر بیٹھے زمین اُگل دے سو یہ نہیں ہو سکتا"

" خیر کاکا جو بھی ہو اب تو ایک دفعہ شہر جا کر قسمت آزمائیں گے پھر دیکھا جائے گا"

" جاؤ بیٹا یہ کھیل بھی کھیل ڈالو"

" کاکا کچھ روپیے کی ضرورت تھی"

" تو میں کیا کروں بیٹا۔ میں روپیہ کہاں سے لاؤں۔ روپیہ پیسہ سب لڑکوں کے ہاتھ میں ہے۔ میں تو یہاں جنگل میں پڑا رہتا ہوں۔ مجھے تو صبح شام روٹی کھانا ہے۔ اور کھیتوں میں کام کرنا۔ میرے پاس نہ روپیہ ہے نہ پیسہ"

" چاہے جہاں پڑے رہو، مالک تو تم ہی ہو حکم تو تمہارا ہی چلتا ہے۔ ہمارے کھیت لے لو اور پانچ سو روپیہ دے دو۔ جب ہم روپیہ ادا کر دینگے تو اپنے کھیت لے لیں گے"

کھیتوں کا نام سن کر شیو ناتھ سنگھ چونک پڑا" تو کیا اب زمین بھی گروی رکھو گے"

" رکھنا ہی پڑے گا۔ ایسے ہی روپیہ کون دیدے گا"

"دیکھو بیٹا یہ لڑکپن چھوڑ دو - جو کام تم کر سکتے ہو جس کام کو تم جانتے ہو وہ کام چھوڑ کے شہر میں روزگار کرو گے تو دھوکا کھاؤ گے۔

"یہ بات نہیں کاکا - ہم ایسے دھوکا کھانے والے نہیں ہیں۔"

کاکا مسکرائے - انھوں نے سوچا - اس لڑکے پر بھوت سوار ہے یہ مانے گا نہیں - کچھ دیر چپ رہ کر وہ بولے

"اچھا بیٹا جو تمہاری سمجھ میں آئے سو کرو"

"تو روپے کی بابت کیا کہتے ہو"

"روپیہ میرے پاس نہیں بیٹا"

"اچھی بات ہے تو ہم کہیں دوسری جگہ دیکھیں گے"۔

(۳)

سندر سنگھ کاکا کے یہاں نکل کر گاؤں کے زمیندار پھاٹک جی کے پاس پہونچا - پھاٹک جی نے پوچھا "کیسے آئے سندر؟"

"ایک پانچ سو روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس لئے آپ کے پاس آئے تھے"

"پانچ سو روپیہ"

"ہاں سرکار، ہم اپنی زمین گروی رکھ دیں گے"

"اچھا یہ بات ہے۔ ٹھیک - روپے کرو گے کیا"

"سرکار یہاں کھیتی میں ہمارا دل نہیں لگتا - شہر میں جا کر کچھ روزگار کریں گے"

"یہ کہو - اچھا بیاج کیا دو گے"

"جو سرکار کی مرجی ہو - ہم گریب آدمی ہیں۔ یہ سمجھ کے جو آپ کا

حکم ہوگا دیں گے"۔

"بیاج دو روپیہ سینکڑہ پڑے گا"

"دو روپے - ارے نہیں مالک - ہم سے ایک روپیہ لے لینا"

"ایک روپیہ میں کہیں سے ملے تو وہیں سے لے لو"

"ہمارے مالک ماں باپ تو آپ ہی ہیں - ہم اور کہاں جائیں"

"ہم نے تو کہہ دیا - دو روپے بیاج پڑے گا"

"اچھا مالک ہمیں آنے لے لو - ہم آپ کی رعایا ہیں سرکار ہم سے تو رعایت ہونی ہی چاہیئے"۔

"اچھا تو پونے دو دے دینا بھی"

"ارے نہیں راجہ - اتنا نہیں دے پاؤں گا - ڈیڑھ روپیہ لے لو"

"اچھا تو کل آنا - ہم غور کرلیں"

"بہت اچھا کل اسی بکت آؤں گا"

سندر سنگھ کے جانے کے بعد پھاٹک جی نے ایک آدمی بھیج کر شیوناتھ سنگھ کو بلوایا - شیوناتھ سنگھ کے آجانے پر اس سے پھاٹک جی بولے --- "سندر سنگھ اپنے کھیت رہن رکھ کر پانچ سو روپیہ مانگتا ہے - ہم نے سوچا کہ تم سے بھی پوچھ لیں - کل کو یہ نہ کہو کہ پھاٹک جی نے چپکے چپکے کھیت لے لئے"۔

"ارے نہیں مالک - آپ کو کیا کمی ہے جو چپکے چپکے لے لیں - وہ میرے پاس بھی آیا تھا - لیکن میں نے روپیہ دینے سے انکار کر دیا"۔

"کیوں"

"روپیہ برباد کر دے گا - کھیت بھی چلے جائیں گے"۔

"چلے کیوں جائیں گے۔ تمہارے پاس تو رہیں گے۔ اگر ہم نے نہ لیا تو کہیں اور کوئی دوسرا لے لیگا تو پھر چلے ہی تو جائیں گے"۔

"آپ روپیہ مت دیں"۔

"مگر ٹھاکر اس سے ہوگا کیا۔ کوئی دوسرا دیدے گا۔ اس کی زمین پر کوئی بھی پانچ سو دے سکتا ہے۔ اچھی زمین ہے۔ اس پر پانچسو مل جانا کوئی دشوار بات نہیں"۔

شیو ناتھ سنگھ فکر میں پڑ گیا۔ پھاٹک جی کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ سوچ کے بولا "آپ کی بات ٹھیک ہے۔ روپیے اسے مل جائینگے"۔

"سوچ لو۔ ہمیں کھیتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ کوئی دوسرا کھیت نہ لینے پاوئے ہمیں روپیہ دینا پڑے گا"۔

"تو سرکار ہم ہی روپیہ دیدیں گے لیکن ایک بات ہے —— ہم اپنے نام سے نہیں دیں گے"۔

"کیوں؟"

"ہم اپنے نام سے دیں گے تو اسے پھر کوئی کھٹکا نہیں رہے گا۔ وہ سمجھے گا کہ کاکا کا روپیہ ہے۔ کاکا ہم پر نالش کرنے تھوڑا ہی جائیں گے"۔

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے"۔ پھاٹک جی ہنس کر بولے۔

"اس لئے ہمارا ارادہ ہے کہ روپیہ ہم آپ کو دے دیں۔ آپ اپنے نام سے دے دیجئے اور اپنے ہی نام سے لکھا پڑھائی کیجئے"۔

"لیکن ہم پر تمہیں اعتبار ہے؟"

"ارے سرکار، آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں۔ آپ راجہ آدمی ہیں۔ ہمارے

غریب کے پانچ سو روپیہ کے لئے آپ بے ایمانی نہیں کریں گے"۔

"مگر آج کل تو کسان زمیندار وں کا رتی بھر بھی بھروسہ نہیں کرتے"

"جو نہ کریں سو نہ کریں۔ اور سبھی جمیندار ایک سے تھوڑا ہی ہوتے ہیں۔ آپ پر ہمیں پورا بھروسہ ہے"۔

"اچھی بات ہے۔ تم بڑے سمجھ دار آدمی ہو ٹھاکر"

"سب سرکار کے جوتیوں کا طفیل ہے۔ ہم کچھ تو پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ آپ لوگوں کے پاس بیٹھ بیٹھ کر اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ اچھا تو ہم آج روپیے بھیج دیں گے"۔

"بیاج تو لیا ہی جائے گا"

لکھا تو لینا ہی۔ لینا نہ لینا تو اپنی مرجی پر ہے"

شام کو ارجن سنگھ پھاٹک جی کو پانچ سو روپیے دے گیا۔ دوسرے دن پھاٹک جی نے سندر سنگھ کو روپیے دے کر لکھا پڑھائی کر لی

روپیہ پانے کے چار دن بعد سندر سنگھ گاؤں کے دو اور نوجوانوں کو ساتھ لے کر شہر چلا گیا۔ اپنے بال بچے گاؤں میں ہی چھوڑ گیا کہ شہر میں کام ٹھیک ہو جانے پر بلا لیا جائے گا۔

(۴)

سندر سنگھ کو گاؤں سے گئے تین مہینے ہو گئے۔ گاؤں میں شیونا تھ سنگھ کو یہ اطلاع ملی کہ سندر سنگھ نے شہر میں "پرچونی" کی دوکان کھولی ہے۔ جو نوجوان اسکے ساتھ گئے تھے ــــ اُن میں سے ایک پندرہ دن کے بعد گاؤں لوٹ آیا تھا۔ ایک اس کے ساتھ رہ گیا تھا۔

وقت بے وقت گاؤں میں سندر کے بارے میں طرح طرح کی اطلاعیں آتی رہتی تھیں کبھی کوئی آکر کہتا —— "دکان اچھی چل رہی ہے۔ دو روپے روز کی پیدا ہے" کبھی کوئی کہتا —— "ارے وہ دو چار مہینے میں سب پھونک پھانک کر آتا ہے۔ سنا ہے، دیکھا تو نہیں۔ وہ شام کو رنڈیوں کے محلہ میں گھومنے جاتے ہیں۔ دوسرے تیسرے سینما دیکھتے ہیں۔ وہاں دو چار غنڈوں کا ساتھ ہو گیا ہے۔ موج مناتے ہیں"

سندر کو شہر گئے چھ مہینے ہو گئے تھے لیکن ابھی تک بال بچے گاؤں ہی میں تھے۔ اسی اثنا میں خدا کی کرنی سے پھاٹک جی بیمار پڑے اور ایک ہفتہ کی بیماری میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کا لڑکا شیوادھر پھاٹک ان کی جائداد کا قابض ٹھہرا۔ اس کی عمر اکیس بائیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔

پھاٹک جی کی موت کے بعد ارجن سنگھ شیو ناتھ سنگھ سے بولا —— "اب ہمارے روپیوں کا کیا ہوگا۔ چھوٹے سرکار روپے کبول کریں گے"

"اب یہ تو ان کا دھرم ایمان جانے بڑے پنڈت رہتے تب تو کوئی کھٹکا نہیں تھا مگر اب کچھ نہیں کہہ سکتا"

"اس بکت ہم نے منع کیا تھا کہ اس جھنجھٹ میں نہ پڑو زمین جائے چولھے بھاڑ میں"

"کیسے چولھے بھاڑ میں جائے۔ واہ! بڑے بھیا مرتے وقت کہہ گئے تھے کہ —— شیوناتھ میرے بال بچے تمہارے سپرد ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا۔ تم ان کا خیال نہ کرنا۔ میرا خیال کرنا۔ یہ سوچنا کہ میرے بڑے بھائی کے بال بچے ہیں"

یہ کہتے کہتے شیوناتھ سنگھ کا گلا بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا گئے

آنسو پونچھتے ہوئے وہ بولا —— "نہیں تو ان کی بات کا خیال ہے۔ سندر نالایک

نکل گیا تو نکل جائے - پھر بھی اس کے بال بچے ہماری ہی اولاد ہیں - ہمیں انکا خیال ہے زمین چلی جائے گی تو وہ کیا بھوکوں مریں گے ؟"

"تو تم کہاں تک زمین بچاؤ گے ؟"

"جہاں تک بچائے بنے گی"

"اچھی بات ہے - ابھی پہلے تو یہی دیکھنا ہے کہ چھوٹے سرکار کیا کہتے ہیں"

"کھیت کا کام ہو جائے ہیں چھوٹے پنڈت کے پاس جاؤں گا - دیکھوں کیا کہتے ہیں"۔

"ھجار ہاتھ تو وہ کیوں لیں گے نہیں"

"نہ سمجھو نہیں - اپنے روپے ہی تو لیں گے"

"ہاں تو تم یہاں جنگل میں پڑے رات دن کھون پانی کر کے کماؤ - اور سندر راڑاوے — موج کرے — ایک ھجار کی ٹھوکر لگے گی — پانچ سو وہ گئے اور پانچ سو اور — بیاج دینا پڑے گا"

"دیکھا جائے گا — بھگوان کی جو مرجی ہوگی سو ہوگا - تم فکر نہ کرو - جب تک ہم جندا ہیں تب تک تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے"

کھیت کے کام ختم کر کے شیو ناتھ سنگھ شیوادھر پجاٹک کے پاس پہنچا بڑے پنڈت جی کی موت کے بارے میں کچھ دیر تک افسوس کی باتیں کر کے شیو ناتھ سنگھ پوچھا — مالک - سندر سنگھ کی زمین کا کاغذ جو آپ کے پاس ہے اس کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہوگا"۔

"کیسا حال" شیوادھر نے پیشانی سکڑ کر کہا۔

"بڑے پنڈت آپ سے کچھ نہیں کہہ گئے"

"ہم سے تو کچھ نہیں کہا"

"جب سندر سنگھ نے روپیہ لیا تھا اس بکت تو آپ کو معلوم ہی ہوگا"

"ہاں اتنا معلوم ہوا تھا کہ سندر سنگھ نے پانچ سو روپیہ پر ہمارے یہاں زمین گرو رکھی ہے"۔

"شیو ناتھ سنگھ نے خیال کیا — بڑے پنڈت نے اس بکت کسی کو نہیں بتایا ہوگا کہ روپیہ ہم نے دیا ہے — اور انھوں نے ٹھیک کیا۔ بتا دیتے تو سندر کو پتہ چل جاتا۔ لیکن کیا مرتے دم بھی انھوں نے چھوٹے پنڈت سے — یا اپنے گھر میں بیوی سے نہیں کہا۔ یہ سوچ کر شیو ناتھ بولا — "بڑے مالک تو — کیا بتائیں۔ ایک خواب سا ہو گیا۔ کون جانتا تھا کہ اتنی جلدی چلے جائیں گے۔ انھیں بھی یہ گمان نہ ہوا ہوگا کہ آخری دم ہے"۔

"نہیں وہ تو یہ بات جان گئے تھے ٹھاکر۔ ایک روز پہلے جب میں دوا دینے لگا تو بولے — "اب دوا کا کام نہیں ہے۔ اب ہم بچیں گے نہیں"۔

شیو ناتھ سنگھ سوچتا رہا — تب تو انھوں نے ضرور کہا ہوگا۔ جب انھیں اپنے بچنے کا یقین نہیں رہا تھا تو انھوں نے اپنا سب لین دین بتایا ہوگا اس کے ساتھ یہ بات بھی کہی ہوگی۔ بڑے پنڈت ایسے نہیں تھے جو مرتے دم بے ایمانی کرتے۔ معلوم ہوتا ہے چھوٹے پنڈت کی نیت بدل گئی۔ یہ سوچ کر اس نے کچھ نہیں کہا۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر چل دیا۔ باہر میکو سے ملاقات ہوئی۔ شیو ناتھ سنگھ بولا — "کیا بتائیں میکو۔ ہم مرتے دم بڑے پنڈت کے درسن نہیں کر سکے۔ اس کا بڑا رنج ہے"۔

میکو بولا — "بڑے پنڈت نے تو مرنے سے ایک دن پہلے تمہیں یاد کیا تھا۔

چھوٹے سرکار سے کہا تھا کہ سیوناتھ سنگھ کو بلاؤ مگر چھوٹے سرکار نے کچھ دھیان نہ دیا۔ ایک دیچھ پھر انھوں نے کہا "سیوناتھ سنگہ کو بلاؤ" چھوٹے سرکار بولے — "بلا دیں گے" یہ ہمارے سامنے کی بات ہے۔

شیوناتھ سنگہ کو یقین ہو گیا کہ — بڑے پنڈت نے اس لئے بلایا تھا کہ ہمارے سامنے چھوٹے پنڈت سے روپیوں کی بات کہہ دیں۔ مگر چھوٹے پنڈت ٹال گئے۔ ان کی نیت اس وقت سے خراب ہو گئی تھی۔

شیوناتھ بولا — "ہماری کسمت میں ان کے درسن نہیں لکھے تھے۔ انھوں نے تو یاد کیا تھا۔ بھگوان انھیں سورگ میں جگہ دیں بڑے اچھے آدمی تھے"

ہیکو بولا — "یہ تو ہزار دفعہ کہا۔ ایسا آدمی ہونا مسکل ہے کاکا۔ اب دیکھو ان سے کیسی نبھتی ہے۔ اُن کے راج میں تو ہم نے بڑا سکھ اٹھایا۔" "وہ بات کہاں میکو بھیا"

"ٹھیک کہتے ہو کاکا — یہہ بات انھیں کے ساتھ چلی گئی"۔

شیوناتھ سنگہ چلا گیا۔

ادھر شیوناتھ سنگہ کے جانے کے بعد شیو ادھر اپنے ہی آپ مسکرا کر بولے۔ "منوانے آیا تھا۔ اب ان گنواروں جتنی عقل بھی ہم میں نہیں ہے۔ ہوں۔ چلا گیا چپ چاپ۔ ہمت نہیں ہوئی۔ کچھ بولتا تو وہ ڈانٹ بتاتا کہ یاد کرتا۔"

شیوناتھ سنگھ اپنی جھونپڑی میں واپس آیا۔ ایک چلم بھری۔ حقہ نکالا حقہ پیتے ہوئے وہ غور کرنے لگا — سوچتے سوچتے اپنے آپ کہنے لگا — نہیں۔ اس کا جکر کسی سے بھی کرنا ٹھیک نہیں۔

شیو ادھر پنڈت کی بدنامی ہوئی تو بڑے پنڈت کی بدنامی ہوگی۔
لڑکے تو انھیں کے ہیں۔ لوگ بھی تو کہیں گے کہ فلانے کا لڑکا بے ایمان نکلا
بڑے پنڈت کی بدنامی کبھی نہ ہونے دوں گا ان کی روح کو دُکھ ہوگا۔
وہ یہی سوچ رہا تھا کہ گاؤں کے مکھیا گجادھر ترویدی اس کی
طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ شیو ناتھ نے جھٹ پٹ حقہ رکھ دیا اور
اٹھ کھڑا ہو گیا۔ ان کے قریب آنے پر اس نے "پال آگن" کیا۔ سلام کا
جواب دے کر ترویدی جی بولے — کہو ٹھاکر مزے ہیں"
"سب آپ کے جوتیوں کی برکت ہے۔ آج بڑی تکلیف کی،"
"ہاں ادھر ہی چلے آئے۔ تم سے ایک کام بھی تھا"
"حکم"
"حکم کچھ نہیں۔ بڑے پنڈت نے مرنے کے دن ہم سے ایک بات کہی تھی۔
وہی تمہیں بتانے آئے ہیں جس دن وہ مرے ہیں اس دن سویرے ہم
انھیں دیکھنے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ دیوی چرن پنڈت بھی تھے۔ کچھ
دیر کو ہم اور پانڈے جی ان کے پاس اکیلے بھی رہ گئے تھے اور کوئی نہیں
تھا۔ چھوٹے پنڈت بھی نہیں تھے۔
— شاید پانچ منٹ کا وقت رہا تھا۔ اس وقت بڑے پنڈت ہم سے
بولے — سندر کو ہم نے جو روپیہ دیا ہے۔ وہ ہم نے نہیں دیا شیو ناتھ نے
دیا ہے لکھا پڑھی ہمارے نام سے ہے — روپیہ اس نے دیا ہے۔ ہم نے
یہ بات شیو ادھر سے بھی کہہ دی ہے۔ اور آپ لوگوں سے بھی کہے دیتے
ہیں۔ تاکہ اس غریب کا روپیہ نہ مارا جائے"۔

یہ سن کر شیوناتھ پہلے تو ہکا بکا سا ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی اسکے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے۔

" واہ رے پنڈت۔ بھگوان تمہاری روح کو سورگ بخشے۔ میں نے اپنا روپیہ بھر پایا۔ پنڈت۔ تم سورگ میں بے کھٹکے چین کرو۔ مجھے روپیہ مل گیا۔ تم نے اپنا بھرج پورا کیا۔"

اس طرح شیوناتھ کو آسمان کی طرف منہ اٹھائے بڑھتے ہوئے دیکھ کر تریویدی جی دنگ رہ گئے۔ جب شیوناتھ چپ ہو کر آنسو پونچھنے لگا تو تریویدی جی نے پوچھا ——— " یہ کیا کہہ رہے تھے ٹھاکر۔ روپیہ تمہیں مل گیا؟"

" ہاں تریویدی جی۔ بڑے پنڈت جب دے گئے تب بھی نہ ملے گا؟"

" کب دے گئے۔ دے جاتے تو ہم سے ایسا جھوٹ کہہ جاتے؟"

" انھوں نے تو اپنی طرف سے دیدیا بس اتنا ہی کافی ہے۔ چھوٹے سرکار دیں یا نہ دیں۔ مجھے ان سے کوئی مطلب نہیں"۔

" دینگے کیسے نہیں۔ نہ دیں تو تم پنچایت کرو۔ نالش ٹھوکو۔ ہم اور پانڈے جی تمہاری طرف سے گواہی دینگے۔ روپیہ تمہیں ضرور ملے گا"

" ارے تریویدی جی نالس کس پر کروں چھوٹے پنڈت پر۔ بڑے پنڈت کیے لڑکے پر۔ یہ تو مجھ سے نہیں ہو گا۔ مجھے تو روپیہ مل گیا میں نالس کیوں کروں"

" بڑے پاگل آدمی ہو۔ چھوٹے پنڈت سے کہو تو۔ ہم لوگ بھی کہیں گے"۔

" تریویدی جی۔ آپ کے پیر چھوتا ہوں۔ آپ کچھ نہ کہیئے گا۔ آپکو بھگوان کی کسم ہے"

" ہمیں کیا مطلب" یہ کہتے ہوئے تریویدی جی چلے گئے۔

رات میں ایک آم کے پیڑ کے نیچے شیو ناتھ سنگھ گڑھا کھود رہا تھا کھود کر اس نے ایک ہانڈی نکالی۔ ہانڈی میں روپیے تھے۔ اس نے روپیے گنے۔ سات سو نکلے۔ شیو ناتھ سنگھ نے چھ سو روپیے ان میں سے نکال کر باقی سو روپیے اُسی ہانڈی میں رکھ کر پھر گاڑ دیئے۔ یہ روپیے اس نے لڑکوں سے چھپا کر آڑے وقت کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔

دوسرے دن شیو ناتھ سنگھ شیوادھر کے پاس پہونچا۔ کچھ خاموش رہ کر اس نے کہا —— "سندر کے روپئے لیجئے اور کاغذ دیدیجئے۔"

کچھ دیر کے لئے شیوادھر کا چہرہ سفید پڑ گیا لیکن فوراً ہی حلیہ سدھار کر وہ بولے —— "اچھی بات ہے۔ کاغذ ہم لاتے ہیں"۔

شیوادھر کاغذ لے آئے۔ شیو ناتھ سنگھ نے پوچھا —— "کتنا روپیہ ہوا" شیوادھر نے حساب جوڑ کر بتایا —— "پانچسو اصل کے اور سات مہینے کا بیاج ڈیڑھ روپیہ سینکڑا کے حساب سے ہے —— ویسے تو سات مہینے چار دن ہوئے لیکن چار دن کا بیاج ہم چھوڑ دیں گے"۔

"کاہے کو چھوڑو گے سرکار وہ بھی جوڑ لیں"

"نہیں اب چار دن کا بیاج تم سے کیا لیں"۔ شیوادھر نے آنکھیں نیچی کر کے کہا۔

"نہیں سرکار —— آپ کی جوتیوں کی برکت سے میں چار دن کا بیاج دے سکتا ہوں حساب میں کیا مروّت۔ حساب پیسہ پیسہ کا ہونا چاہیئے ویسے ہم بھوکے ہوں تو آپ سے چاہے جو مانگ لیجائیں۔ مگر حساب تو ہونا ہی چاہیئے"

پنڈت شیوادھر جنہوں نے بی۔ اے تک تعلیم پائی تھی لیکن کامیاب نہیں

کر سکے تھے۔ اس وقت اس اجڈ گنوار اور جنگلی۔ رات دن بیل کی طرح کھیتوں میں کام کرنے والے پھٹے پرانے کپڑے پہنے کسان کے سامنے اپنے فعل کو ایسا محسوس کر رہے تھے جیسے کسی عالم کے سامنے کوئی جاہل گنوار اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگتا ہے۔

وہ جھینپ کر بولے ـــــ "جیسی تمہاری مرضی"

شیو ناتھ نے کل روپیہ چکا کر کاغذ واپس لے لیا۔

شیو ناتھ سنگھ کے چلے جانے پر شیوادھر نے ماتھے پر سے پسینے کے ساتھ ہی ساتھ روح کی کثافت کو بھی پونچھ ڈالا اور مسکرا کر اپنے آپ کہنے لگا ـــــ "جنگلی بیوقوف کہیں کا"

ادھر شیو ناتھ ایک غیر معمولی قوت محسوس کرتا چلا جا رہا تھا۔

سہاگ کی رات

آج سہاگ کی رات جو آگئی ہے۔ اس لئے مانگ میں سیندور بھرا جائے گا۔ ماتھے پر لال بندی لگائی جائے گی۔ پتلی پتلی نازک کلائیوں میں ہری ہری چوڑیاں جھنجھنائیں گی۔ گورے گورے تلوں کی کوروں پر مہندی لگائی جائے گی۔ ننھی ننھی انگلیاں جانے کب سے آرزو کر رہی ہوں گی۔ آج ہی ان میں چھوٹے چھوٹے بچھوے پہنا دیئے جائینگے ملائم ہاتھوں کی سفید ہتھیلیاں آج مہندی سے رچ دی جائیں گی

آج سہاگ کی رات جو ہے۔ یہ رات ٹل نہیں سکتی۔

کل تک وہ کنواری تھی۔ زندگی میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں تھا۔

سونا سونا سا ——— آج کوئی اجنبی نا آشنا اس کے تن من کا مالک بنجائیگا۔ زندگی میں وہی کچھ دیر سارا رس گھول دے گا۔ زندگی بھر ساتھ رہے گا۔ ساتھی بن کر! اسے سکھی رکھے گا۔!

جو خواب ہے آج وہ سچ ہو جائے گا۔

منڈپ کے نیچے ہونے والے شوہر کے ساتھ اس کی گرہ پڑنے لگی۔ باہر شہنائی کی آواز کانپ رہی تھی۔

سارے گھر میں جگ مگ جگ مگ ....!

پنڈت نے منتر پڑھے اور وہ دونوں دو لمحوں میں ایک ہو گئے۔ خدا جانے کہاں سے آکر وہ اس کی زندگی میں سما گیا۔ آج سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ آج سب کچھ ہو گیا۔

وہ اجنبی آج اس کا مالک ہو گیا۔ چاہے دکھ دے چاہے آرام پہونچائے وہ اس کی ہے۔ جو ہو گا سہے گی۔

وہ اس کی بن گئی۔

اور وہ بہت سے روپیے اور سامان کے ساتھ ایک خوبصورت سی لڑکی کو اپنی زندگی کا پیار دینے کے لئے کہیں نامعلوم مقام کی طرف لئے جا رہا تھا........!

ریل نے اسٹیشن چھوڑ دیا

............!

اور ادھر مرگھٹ کی سی خاموشی چھا گئی۔ بجلی کے قمقمے بجھ گئے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو گیا۔ شہنائی کی آواز غائب ہو گئی۔ نہ جانے کہاں۔ ماں باپ کے ایک لڑکی تھی۔ بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا تھا سماج کی انگلی اٹھی اور وہ جوان مان لی گئی۔ ماں باپ فکروں سے نہ معلوم کتنی راتیں جاگتے رہے کتنے ہی دن بھوکے رہے اور آج وہ لڑکی ایک پل میں ان کی نہ رہی۔ کوئی اجنبی لے گیا۔ جھٹ سے وہ اسے ریل کی طرح گذرتی ہوئی دیکھ کر رہ گئے۔

اسے پالا تھا بڑے ناز و نخرے سے لاڈ پیار سے اور وہ چلی گئی کہیں!

ماں کے آنسو اُبل پڑے۔

باپ کا دل بیٹھ گیا!

آج وہ ایک دوسرے کو آنکھیں کھول کر دیکھیں گے۔ جانے کتنی باتیں کرنی ہیں۔ جی کھول کر رکھ دینگے ایک دوسرے کے سامنے۔ زندگی بھر کے ساتھی جو بن گئے ہیں! ساتھی سے نہ کہیں گے تو کس سے کہیں گے۔

پھولوں سے سجا ہوا اونچا سا جگمگاتا ہوا پلنگ ریشمی مسہری، مخملی گدّے، پھولوں کی مالا تیز تیز خوشبو میں بسی ہوئی، وہ پلنگ پر بیٹھی تھی۔ پریوں کے ملک میں آگئی ہو جیسے!

ایک کونے میں رکھے ہوئے عود دان سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ چھت کے بیچوں بیچ بجلی کے چار ہرے قمقمے چمک رہے تھے۔

وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ گھر والوں سے بچھڑ گئی ہے اس دُکھ سے یا اپنے شریک زندگی سے ملنے کی بیقراری میں۔ نہیں کہا جا سکتا۔

آہستہ سے کھٹکے کی چٹ سے آواز ہوئی۔ دروازہ بند کر کے اس کا شریک حیات کمرے میں آیا۔ ریشمی کرتا، سفید دھوتی، چمکتے ہوئے بال، پیروں میں چپل اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ——— خوبصورت جوان تھا وہ۔

پلنگ پر وہ اسکے قریب بیٹھ گیا۔ ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کر اپنی طرف کھسکایا۔ "روٹھ گئیں کیا؟"

کچھ بولی نہیں۔

وہ کچھ بولی نہیں۔

پھر وہ شرم کے مارے سہما ہوا گھونگٹ اسکے چہرہ سے سرکا دیا وہ رو رہی تھی

ایسی ہی بیٹھی رہی!

" روتی ہو، میری طرف دیکھو ذرا "!

اس نے نہیں دیکھا۔

ٹھوڑی پکڑ کر اس نے اس کا چہرہ اپنی طرف اٹھایا اور آنسو پونچھ کر ہونٹوں کو چوم لیا۔ وہ پھر بھی خاموش تصویر بنی رہی۔

" کیا مجھے ہنسیں نہیں؟

اس دفعہ اس نے اس کی طرف دیکھا اور ایک دم پھوٹ پڑی — " ناتھ "

اس نے اسے اپنی گود میں لے لیا۔

" تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو

....

بولو میری رانی....

....

نہیں بولو گی

کیوں.....

میں نے پوچھا کہ تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو

....

پھر چپ ہو گئیں "

" ... بہت "

" آخر کتنا — اس نے مسکرا دیا!

" .... اتنا! — اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر اسے جکڑ لیا۔

وہ ہنسا اور وہ بھی ہنس پڑی!

"اور تم"

"میں تمہیں اتنا پیار کرتا ہوں جتنا کوئی کسی سے نہیں کرتا ہوگا!"

"آخر کتنا" —— وہ بولی!

"اتنا! —" اور اسے زور سے پکڑ کر چوم لیا

"اتنا ہی کرتے رہو گے؟"

"تم میرے دل کی رانی ہو - دیوی ہو میں تمہارا پجاری ہوں"

اور اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی۔

اس کی مانگ کا سیندور اڑ گیا - ماتھے کی بندی مٹ گئی - مہندی گھل گئی - چوڑیاں بڑھ گئیں - بچھوے اتر گئے - مہندی کا رنگ اڑ گیا وہ سہاگن تھی اسے زندگی بھر کے لئے کسی کا پیار ملا تھا اور وہ آج بیوہ ہو گئی - اس کا سہاگ لٹ گیا - ایک دن اس کی شادی ہوئی تھی: کوئی اسے اپنا ملا تھا!

اس کی سہاگ کی رات تھی اس دن ......

اس نے کہا تھا میں تمہارا ہوں اور آج سنسان مرگھٹ میں پرانے پیپل کی گھنی چھاؤں میں ایک نعش جل رہی تھی ......!

باغی

میں نہیں مانتا —— نہیں مانتا —— پرماتما کو میں نہیں مانتا ——
بحث کرنا چاہتے ہو۔ مذہب اور دھرم کی صداقت ظاہر کرنا چاہتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ممکن ہے پرماتما نام کا کوئی ہے —— لیکن میں نہیں مانتا۔ کیوں مانوں، اگر ماننے کی کوئی معقول وجہ ہے تو میرے لئے نہ ماننے کی بھی کیا کافی وجہ نہیں ہے۔ انسان کیا بلا سبب باغی ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسا خیال کرتا ہے تو وہ انسان کی فطرت کو مطلق نہیں جانتا۔

بہت سے آدمیوں کو میں پرماتما سے کہیں زیادہ اچھا سمجھتا ہوں۔ کنفیوشیس —— بدھ —— عیسیٰ ...... انسانوں کی بھلائی کے لئے انھوں نے جتنا رویا ہے جس قدر سوچا اور غور کیا ہے۔ جتنا ایثار کیا ہے پرماتما میں اتنی خوبیاں کبھی بھی مجھے نہیں دکھائی دیں۔ اُس کی اہمیت جتا کر اور اپنی بے لوث محبت کا اظہار کر کے تم لوگ ایشور کو ہی بڑا کرنا چاہتے ہو۔ اس پر بھی مجھے اعتراض ہے —— خاص اعتراض ہے —— پرماتما چاہے کچھ بھی ہو مگر کبھی بھلائی کے کام کرنے والا نہیں ہے۔ وہ ٹھگ سے بھی زیادہ ظالم اور سنگ دل ہے۔ ٹھگ تو گلا گھونٹ کر ایک دو منٹ میں ختم کر دیتا ہے۔ لیکن پرماتما ہم لوگوں کو قتل کرتا ہے۔ دن پر دن۔ آہستہ آہستہ۔ تھوڑا تھوڑا کر کے بلکہ تمام عمر۔ نادان بچہ بھی توڑنے کے لئے گھروندا نہیں بناتا۔ وہ بھی اس

حیثیت سے پرماتما سے اونچا ہے۔ خالق ہونے کی وجہ سے تم لوگ پرماتما کی پوجا کرتے ہو۔ یہ پوجا ابھی روک دو۔ خالق ہوکر بھی اس کی سختی زیادہ کٹھن طریقہ پر بڑھتی جا رہی ہے۔ جب اس دنیا میں موت سب کے لئے ضروری ہے تو پھر پرماتما ہم لوگوں کو کیوں پیدا کرتا ہے۔ کیا یہ تم نے کبھی سوچا ہے۔ اس پر بھی ہم سب کو فنا کرنے کے لئے وہی خالق ہے! اسی لئے ہر روز لاکھوں گھائل انسانوں کے دل کے خون سے اسکے ہاتھ لال رہتے ہیں؟ پھر بھی وہ رحمان ہے۔ وہ پھر سے تخلیق کرتا ہے۔ تاکہ اپنے ہی ہاتھوں سے غارت کر سکے۔ کیا پرماتما انسانوں کا محافظ ہے۔ اچھا تو اس کا کون محافظ ہے؟

(۲)

میں ایک دولتمند گھرانہ کا چشم و چراغ ہوں۔ جس بے فکری اور اطمینان سے زندگی بسر کر کے انسان پرماتما کا بھگت ہوتا ہے بچپن میں میری قسمت میں اس کی کچھ بھی کمی نہیں تھی۔

ویسے ھی ماں۔ باپ اگر ہوتے تو شاید پرماتما کو مانے بغیر مجھ سے رہا نہ جاتا! .... لیکن میری کم عمری ہی میں ھمارے گھرانے کی خوش حالی پر ظلم کے سنگ دل ہاتھوں کا سایہ آہستہ آہستہ پڑنے لگا۔ وہ سایہ ابھی تک نہیں ہٹا ہے۔ بلکہ روز روز اور بھی زیادہ گھنا ہو کر گہرے اندھیرے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔

یہ سوچ کر میں تعجب کرتا ہوں کہ کیا ہمارے خاندان ہی سے پرماتما کی جابرانہ قوت کو امتحان لینا تھا۔ یا بدقسمت ہونے پر انسان کے خیالات ہی ایسے طوفان خیز ہو جاتے ہیں۔ اس پر میں نے کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اپنے اس

تعجب کی کوئی انتہا نہیں پا رہا تھا۔ اور بھی نہ جانے نصیب میں کیا کیا لکھا ہو۔

میری بدقسمتی کی دو چار باتیں تم بھی سن لو شاید تم سن کر برداشت نہ کر سکو گے پھر بھی سن لو۔

ایلائینس بینک کے فیل ہو جانے کی وجہ سے میرے والد قریب قریب دیوالیہ ہو گئے۔ ہم لوگوں کی حالت ایک بھکاری گھرانے کی طرح ہو گئی۔ یہ حالت میرے والد سے زیادہ دنوں تک نہیں دیکھی جا سکی۔ اس لئے انھوں نے اس دنیا کے سارے بندھن کاٹ کر موت کی آغوش میں پناہ لی۔ پھر بڑے بھائی کا جن کی آمدنی سے اس وقت کسی طرح ہم لوگوں کی گذر بسر ہو رہی تھی انتقال ہو گیا

پہلے ہی میں نے کہا ہے کہ زندگی کی ابتدا ہی سے میں نے کبھی کسی دکھ کا مزہ نہیں چکھا ہے۔ گھر میں میں سب کا چہیتا لڑکا تھا۔ میں ہمیشہ اپنے والد کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ اپنے کسی کام سے وہ دو مرتبہ یورپ گئے تھے۔ اس خیال سے کہ کہیں میں رنجیدہ نہ ہو جاؤں انھوں نے مجھے چھوڑ کر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ میری والدہ مجھے تیرہ دن کی عمر کا چھوڑ کر مری تھیں۔ اس وقت سے میں اپنے والد کی گود میں پلا تھا۔ اس لئے ہمیشہ وہ مجھے بہت چاہتے تھے۔

میرے والد مغربی ڈھنگ اور مزاج کے آدمی تھے۔ ان کے ساتھ رہکر میری زندگی کا کچھ حصہ یورپ ہی میں بسر ہوا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں دو دفعہ یورپ کا سفر کر کے اور الہ آباد کے اینگلو انڈین اسکول میں پڑھ کر مجھ میں اتنی قابلیت پیدا ہو گئی تھی کہ میں کسی اچھے انگریز سے بھی عمدہ زبان لکھ سکتا تھا

بچپن سے ہی میرے دماغ میں یہ خیال آتا تھا کہ میں انگریزی میں خوب نام کماؤں گا۔

جب میرے بھائی کا انتقال ہوا اس وقت صرف یہی ایک بات میرے دماغ میں تھی۔ میں ہندوستان انگلینڈ اور امریکہ کے ہر ایک رسالہ میں افسانے ناول اور مضمون لکھتا تھا۔ میرے لکھے ہوئے تین چار ناول انگلینڈ اور امریکہ میں بہت مقبول ہوئے تھے۔ ان ناولوں میں میں نے ہندوستان کی قومی اور سماجی زندگی کا صحیح نقشہ کھینچنے کی کوشش کی تھی شاید میرے یہ خیالات سمندر پار رہنے والوں کو پسند آگئے تھے۔

لیکن انگریزی ادب ہی میری زندگی کا سہارا بن جائے گا یہ میں نے کبھی بھی نہیں خیال کیا تھا۔ بھائی کی اچانک موت کے بعد جب گھر کی حالت بہت ہی بری ہو گئی۔ قرض لے کر گاڑی چل رہی تھی اس وقت بمبئی میں ایک انگریزی رسالہ کے ایڈیٹر کا عہدہ پاکر میں نے پرماتما کا ہزار ہزار شکر ادا کیا۔ وہ میں آج بھی نہیں بھولا مگر اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا کہ شکر ادا کرنے سے پرماتما پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور انسانوں کا شکار کرنے سے وہ کبھی غافل نہیں رہتے ہیں۔

مجھے کافی موٹی تنخواہ ملتی تھی۔ اسکے بھروسہ پر میں نے شادی بھی کر لی کچھ عرصہ تک نئی محبت کے رنگین خوابوں کا مزہ ملتا رہا۔ یہاں شاعر کے الفاظ میں اس مسرت کا اظہار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں عشق اور محبت کی داستان سنانے نہیں بیٹھا ہوں۔ دوسرے اس کے اظہار کی مجھ میں طاقت بھی نہیں ہے۔

شادی کے بعد چار سال گذر گئے۔ سوچا کہ اتنی مصیبتوں کا سامنا کرنے کے بعد قسمت کے فولادی پنجہ سے چھٹکارا ملا ——— غلط سوچا تھا۔ بیماری نے یہ میرا بھرم توڑ دیا۔ میرے لئے پرماتما نے راحت کا جو سامان فراہم کیا تھا دھوکہ دیکر اسے پھر مجھ سے چھین لیا۔ میں مظلومی کی حالت میں پڑا رہا۔۔۔۔۔۔۔۔

خیال نہیں رو رو کر یا اور کسی وجہ سے لیکن یہ معلوم تھا کہ اب میری زندگی کی چند ہی گھڑیاں باقی رہ گئیں ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ سب نے ایک ہی بات کہی "تم اندھے ہو جاؤ گے اور کوئی چارہ نہیں"

اوف! یہ کتنی صدمہ پہونچانے والی بات تھی جو پیدائش سے اندھا ہے اس کی تکلیف میری تکلیف کے مقابل کیا ہے۔ زمین کے پردے پر یہ رنگین کھیل اور یہ حسن کا میلہ جس نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے وہ کیسے سمجھ سکے گا کہ ان سے جدا ہونے کا انجام کیا ہے۔۔۔۔۔ میری آنکھوں کے سامنے تاریکی کا پردہ اور بھی موٹا ہونے لگا۔ میں روزانہ یہ دیکھ رہا تھا کہ روشن سورج کی چمک اور اس کی سنہری روپہلی کرنوں کی رنگینیاں میرے سامنے سے پانی کی لکیر کی طرح مٹ مٹ کر غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ افق کی سرخی، صبح کی سفیدی، ڈوبتے ہوئے سورج کی رنگین کرنیں، ٹوٹے ہوئے بادلوں میں چاند کی روشنی، برسات کی بیقرار ندیاں، جاڑوں کی سنہری دھوپ، بسنت کا پھولوں سے لدا ہوا باغ، صبح صادق کا دھندلکہ ——— رخصت ——— رخصت ——— تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت

دوستو! ہمیشہ کے لئے خیر باد۔

(۳)

میں اندھا ہوں ——— اندھے پن کی اس تاریک دنیا میں دس سال سے ڈوبا ہوا ہوں۔ میری لڑکی چھایا میری شریک حیات کی ایک چھوٹی سی مگر زندہ یادگار ہے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اسے پایا تھا۔ اس وقت اس کی عمر تیرہ سال کی ہے۔ خوش قسمتی سے میرے لئے چھایا کا وجود باقی تھا اس لئے میں نے اب بھی پرماتما کو نہیں بھولا تھا۔

تیرہ سال کی بیٹی ——— چھایا۔ میری زندگی کے ٹوٹے ہوئے پہیہ کی گاڑی کو اپنے دو چھوٹے چھوٹے اور محبت بھرے نازک ہاتھوں سے کسی طرح کھینچ کھینچ کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری بچی شاید ایک دن کے لئے بھی بے فکر ہو کر نہیں کھیل سکی۔ ہوش سنبھالتے ہی اسے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس اندھے اور بوڑھے باپ کی خدمت میں اسے ہمیشہ مصروف رہنا پڑا ہے۔

رسالہ کی ایڈیٹری کا کام چھوڑنا ہی پڑا لیکن رسالہ کے مالک نے میری مجبوری پر ترس کھا کر کچھ روپیہ ماہانہ دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ اس کے لئے میں اس کا احسان مند ہوں۔ میرے پہلے کے لکھے ہوئے انگریزی ناول اب بھی کچھ بک جاتے ہیں۔ کسی طرح میرے دن کٹ رہے ہیں۔

پریشانیوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ میں اور کچھ نہیں سوچ سکتا ——— سوچتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتے ہی دیکھتا ہوں کہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چتائیں دہک دہک کر جل رہی ہیں۔ کتنے دوست کتنے عزیز رشتہ داروں کے کھوئے ہوئے چہرے مرگھٹ کے دھوئیں سے بیتاب ہو کر اٹھ رہے ہیں۔ اوف! تاب نہیں

لیکن یہ مرگھٹ بھی اسکے ہاتھوں فنا کیوں نہ ہو گیا۔!

مستقبل کے بارے میں غور کرنے پر صرف ایک ہی امید دکھائی دیتی ہے میری چھایا کی عمر بڑھ رہی ہے۔ اس کی شادی کرنی ہو گی۔ کیا معلوم کونسا مفلس اور نادار نوجوان اس اندھے کی لاٹھی چھین لے جائے گا۔ سماج کا یہ کیسا سنگین انصاف ہے۔ اس ناامیدی اور پریشانی کے عالم میں ٹھہرا ہوا ہوں پھر بھی مجھے اپنی لڑکی کی شادی کرنی ہو گی!

۴

پرماتما کو ابھی تک میں نے بھولا نہیں ہے۔

خیال کر رہا تھا کہ بدنصیبی کی آخری سیڑھی سے اُتر آیا ہوں۔ اسکے بعد میری موت کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ لیکن پرماتما نے پھر میری غلط فہمی دور کر دی نہیں تو شاید اس ذری سی کمی کے باعث ان کی اتنی بڑی دنیا کے کاروبار درہم برہم ہو جاتے! میری ان لگاتار مصیبتوں کا قصہ واقعی آپ لوگوں کو اچھا نہیں معلوم ہو گا۔ شاید کسی کو خیال ہو گا کہ بڑھا چڑھا کر لکھ رہا ہوں لیکن ایسا نہیں ہے۔ میری ایک بھی بات جھوٹی یا بڑھائی ہوئی نہیں ہے۔ پرماتما کی محبت میں انسان دل و دماغ سے اندھے ہو گئے ہیں۔ یہ آنکھیں ہوتیں تو صاف دیکھتے کہ دنیا میں پرماتما کے مظالم اور اس کی دست درازیاں کتنی بھیانک ہیں۔ لاکھوں مہابھارتوں میں بھی ان مظالم کا تذکرہ نہیں سما سکتا۔ کان لگا کر سنو —— زمین کی یہ ہوا اور سرسراہٹ، مظلوم روحوں کی ٹھنڈی سانسوں اور درد بھری آہیں ہیں یا نہیں۔ جن کو مرنا چاہیئے ان پر تو نہیں مگر جن کو جینا چاہیئے ان پر

پرماتما موت کا پروانہ یکایک بھیج دیتے ہیں۔

بس اب غم کی باتیں اور نہیں کہوں گا۔ اب جو کہنے کا ہے صرف وہی کہوں گا ——

یکایک ایک دن چھایا بیمار پڑ گئی۔ بخار آیا تھا۔ پہلے تو بیماری کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹائیفائیڈ ہے۔

اس موذی مرض کا نام سن کر میرے دل پر کیا گزری وہ میں یہاں بیان نہیں کر سکتا۔

میری ایسی لاچار حالت اور اس پر تباہی۔ میری قسمت میں پریشانی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لکھی ہے۔ اس لئے میں نے شروع ہی سے چھایا کی امید چھوڑ دی۔ اسے موت چھوڑ کر چلی جائے گی یہ خیال میں کبھی اپنے دل میں نہ لا سکا۔

پھر بھی ایک بار آخری کوشش تو کرنی ہی چاہیئے۔ چھایا کو بچانے کیلئے اچھے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ اچھے ڈاکٹر کا علاج کروانے کے لئے کافی روپیہ چاہیئے —— مگر —— مگر دولت کہاں سے لاؤں۔ آخر کیا روپیہ کیلئے اپنی بیٹی کو بغیر علاج کے موت کے منہ میں ڈھکیل دوں۔ اس خیال سے باپ کے دل کا جو حال ہو جاتا ہے کیا یہ تم لوگ سمجھ رہے ہو۔ میری اندھی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ بیٹھا بیٹھا میں سوچتا رہا —— روپیہ —— روپیہ —— روپیہ! روپیے آخر کہاں سے لاؤں۔ کون مجھے روپیے دیگا جس سے میں اپنی چھایا کو پھر موت کے منہ سے چھین لاؤں۔ ایک بات یاد آئی۔ ایک مہینہ پہلے ایک انگریزی رسالہ نے اپنے ایک ملاقاتی کے ذریعہ

(شائد انھیں میری حالت کا علم نہیں تھا) میرے پاس ایک پیام بھیجا تھا کہ کوئی ناول تیار ہو تو وہ اُسے طبع کرنے کے لئے تیار ہیں۔

جب سے میں اندھا ہوا ہوں اور کوئی ناول نہیں لکھ سکا۔ لکھنے کی طاقت نہیں تھی اور نہ دل میں اتنی قوت تھی کہ کسی خیال کا اظہار کر سکوں۔ اسکے علاوہ قلم سے کاغذ پر میں نہیں لکھ سکتا تھا۔ پھر بھی انگریز مُصنّفین کی طرح ٹائپ رائیٹر سے حروف بنا لینا میرے لئے تو ناممکن نہیں تھا۔ میں ہمیشہ سے ٹائپ رائیٹر کا استعمال کرتا آیا ہوں۔ ابھی تک اس کی مدد سے کبھی کبھی خطوط لکھتا ہوں۔

آج مصیبت میں پھنس کر میرے دماغ میں یہ بات آئی۔ اسی وقت رسالہ کے ایڈیٹر کو لکھ بھیجا کہ دو دن کے اندر میرا ایک چھوٹا سا ناول ملنے پر کم سے کم ایک ہزار روپیہ پیشگی دے سکتے ہیں یا نہیں...... جواب ملا کہ میری شرطیں انھیں منظور ہیں۔

تم لوگ سُن کر تعجب نہ کرنا کہ یہ خبر سن کر میں نے پرماتما کا تہِ دل سے شکر ادا کیا۔ صرف ایک مرتبہ ہی نہیں ——— کئی بار۔

۵

شام کو میں نے اپنے کمرہ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ نوکر سے کہہ دیا کہ میں اپنے کمرے سے جب تک باہر نہ نکلوں اس وقت تک کوئی مجھ سے بات کرنے نہ آئے۔ اپنے ایک پارسی دوست کے گھر سے اچھا سا ٹائپ رائیٹر منگوا لیا تھا اس چھوٹی سی مشین پر اب میری چھایا کی زندگی ناچ رہی تھی۔ اسے چھوڑ کر شاید مجھے خودکشی کرنی پڑتی۔

میں بہت جلد سوچ سکتا ہوں اور لکھ بھی سکتا ہوں۔ حساب کر کے دیکھا کہ

اگر لگاتار سترہ گھنٹے محنت کر سکوں تو کل صبح آٹھ نو بجے تک ایک مختصر ناول ختم کر سکوں گا۔

ٹائپ رائیٹر کے سامنے جا بیٹھا۔ قصہ شروع کیا۔ اپنی زندگی کی دکھ بھری کہانی سے۔ اس کے ساتھ اپنی ناکامیوں کا ذکر کرکے پلاٹ کو کافی رنگین حیرت انگیز اور من موہ لینے والا بنانے کی کوشش کی۔ میں جانتا ہوں اپنی زندگی کا جو قصہ تم سب سے کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے وہ بہت ہی سچا اور روز کا سنا ہوا سا ہے۔ دنیا میں ایسے لاکھوں انسان ہیں جن کی پیشانیوں پر قسمت نے میری ہی کہانی جلی حرفوں میں لکھ دی ہے۔ اس قسم کے قصہ کو ناول کی شکل دیتے وقت اس پر اور بھی رنگ چڑھا کر کامیاب بنانا چاہیئے۔ لگاتار سیدھی سادھی اور سچی باتیں بھی بار بار سننا ناممکن ہے۔

میں انتہائی انہماک سے لکھنے لگا۔ اس طرح جی توڑ کر زندگی میں کبھی نہیں لکھا تھا۔ لکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوئی تھی۔ آج اس لکھنے میں نہ صرف کسی کا خیال تھا بلکہ میری اپنی زندگی اور موت میری تاریک زندگی کی ہنسی خوشی مختصر یہ کہ میرا سب کچھ لگا ہوا تھا اس لئے تو لکھ رہا ہوں —— لکھ رہا ہوں اور لکھتا جا رہا ہوں —— رات زیادہ ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا گاڑھا ہو گیا لیکن فضا کی ان تبدیلیوں پر غور کرنے کے لئے میرے پاس ایک لمحہ بھی بیکار نہ تھا۔

بازو کے کمرے سے چھایا اور ملازمہ کی آہٹ سنائی دی۔ چھایا چلا کر بڑبڑا رہی تھی۔ ملازمہ اُسے چپ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں

ٹائپ کرتے کرتے ایک بار رکا...... چھایا اپنے آپ کہہ رہی تھی

"ادھر نہ جانا۔ بابوجی۔ ادھر نہ جانا۔ اس طرف سیڑھی ہے گر پڑیں گے۔ بابوجی۔ تم ابھی تک جاگ رہے ہو۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ جاؤ سوئے جاؤ۔۔۔ نہیں گئے۔ میری بات نہیں مانتے۔ بابوجی اچھا۔۔۔ بابوجی سچ کہنا تم مجھے چاہتے ہو یا ماں کو۔ مجھے! سچ۔۔۔ اپنے سے بھی۔۔۔ دیکھو تو بابو تمہارے لئے کیسا خوب صورت ہار گوندھا ہے۔ ہنی بن کے باغ سے میں خود جوہی توڑ کر لائی ہوں۔ خوشبو آرہی ہے........ بابو تم چپ چاپ بیٹھے رہو۔ مجھے پیار کرنے کی کوشش نہ کرو۔۔۔ ٹھہرو۔ پہلے میں تمہارے بال سنوار دوں۔ تمہارا سر بڑا گندہ ہے۔ لوگ دیکھ کر شکایت نہ کرینگے۔ کہ اتنی بڑی لڑکی ہے مگر باپ کی کچھ بھی خدمت نہیں کرتی"

میری چھایا، میری چھایا بیماری کی حالت میں بھی اپنے باپ کو نہیں بھولتی بے ہوشی کے عالم میں بھی باپ ہی کا خیال کرتی ہے کسی کی ایسی لڑکی ہے!

ڈبڈبائی آنکھوں سے میں نے پھر ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔ لمحہ لمحہ شاید میری چھایا کی زندگی گھٹتی جا رہی ہے۔ ہوا کی ٹھنڈک سے محسوس کر رہا ہوں کہ رات کا آخری حصہ ختم ہو رہا ہے۔ پچھلی رات کا چاند اپنا لال لال چہرہ پچھم کے آسمان کی آغوش میں چھپاتا جا رہا ہو گا۔ سر میں چکر آرہا ہے جسم مردہ ہو گیا ہے۔ دونوں ہاتھ شل ہو رہے ہیں۔۔۔ پھر بھی رک نہیں سکتا۔ ساری رات تھکاوٹ محسوس کئے بغیر یہ مشین "چٹ چٹ" کرتی اسی طرح چل رہی ہے۔

صبح ہوئی۔ اس وقت بھی لکھ رہا تھا۔ ایک ایک صفحہ ٹائپ ہوتا

جا رہا تھا - اور میں قریب رکھے ہوئے ایک بڑے بڑے (   ) ہیں پھینک کر جھٹ پٹ مشین پر ایک اور سفید کاغذ چڑھا رہا تھا - اس طرح ڈیڑھ سو صفحے ٹائپ ہو چکے تھے .... دس بجے کے قریب اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر اپنا ناول ختم کیا - اس وقت میں کس قدر مطمئن تھا یہ بیان نہیں کر سکتا - اس اطمینان کا اظہار کرنے کے لئے ایک اور ناول لکھا جا سکتا ہے - مگر اس وقت میری حالت بہت بری ہے - پھر بھی یہ ساری تکلیف میرے اطمینان کو رتی بھر دبا نہیں سکتی - مجھے اور کچھ سوچنا نہیں تھا - ناول ختم کر لیا ہے - چھایا کے علاج کا بندوبست ہو گیا ہے - بس یہی میرے لئے کافی تھا - مجھے ایک اور خوشی یہ تھی کہ آج میں نے ایک ہی نشست میں جو ناول تمام کیا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود اتنا عمدہ تھا کہ میں اس سے پہلے ایسا ناول نہیں لکھ سکا - اسکے ہر ایک لفظ میں ہر صفحہ پر میں نے اپنے دل کے کتنے ہی ٹکڑے بکھیر دیئے تھے یہ صرف میں ہی جانتا ہوں —— صرف میں ہی جانتا ہوں - لکھنے والے نے کسی دردمند دل کو لئے ہوئے ناول لکھا ہے یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہو گا - مگر انگریز شائقین کو یہ ناول بہت ہی پسند آئے گا -

(٦)

"دروازہ کس نے کھٹکھٹایا"

دروازہ کھولتے ہی میرے گجراتی دوست آنند بھائی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا —— "چھایا کو دیکھنے آیا تھا اس کی طبیعت زیادہ خراب معلوم ہو رہی ہے"

میں نے کہا" آج ہی بمبئی کے بڑے ڈاکٹر کے ہاتھوں میں اسے سونپ دوں گا۔ اب کوئی کسر باقی نہیں رکھوں گا"

آنند بھائی جانتے تھے کہ میں ناول لکھنے والا ہوں ۔۔۔ کہنے لگے "تو کیا تم نے ناول ختم کر ڈالا ہے" ۔ میں نے کہا ۔۔" ہاں ۔۔ اب نہیں شروع سے چلا کر پڑھ لینا ہوگا ۔ کچھ درست کر کے آج ہی مسٹر بر کلے کے پاس بھیج کر روپے منگوا لوں گا ۔۔ کاغذ ٹرے (   ) میں بکھرے پڑے ہیں تم انھیں اٹھا کر ٹھیک تو کر لو۔"

آنند بھائی نے تھوڑی دیر بعد کہا "تمہارے کاغذ کہاں ہیں"

"کیوں میز پر کے لکڑی کے ٹرے (   ) میں!"

آنند بھائی نے کچھ دیر تک ڈھونڈھ کر کہا "ٹرے (   ) میں کاغذ تو بہت ہیں لیکن دونوں طرف سفید!"

میں نے تعجب سے کہا "کیا کہتے ہو آنند بھائی ۔ ذرا اچھی طرح دیکھو تو"

آنند بھائی نے کہا "اور دیکھنے کی ضرورت نہیں ۔ کیا ہوا ہے یہ میں سمجھ گیا ہوں ۔۔" یہ کہہ کر انھوں نے مشین کو چلایا ۔ پھر بولے "واہ رے تمہاری قسمت مشین میں سیاہی کا فیتہ ہی نہیں ہے ۔"

"سیاہی کا فیتہ نہیں ہے! کاغذ دونوں طرف سے سفید ہیں!! تو کیا میں نے بیس گھنٹہ تک بیکار ہی محنت کی"

بازو کے کمرے سے چھایا درد بھری آواز میں چلا اٹھی ۔۔۔۔۔

میرے سر میں زور سے چکر آیا اور میں زمین پر چکرا کر گر پڑا۔......

اور اب اپنی زندگی کی دردناک داستان اس سے زیادہ کہنا نہیں

چاہتا - اور سن کر کیا کرو گے - وہ سب تم سے نہیں سنی جائے گی - صرف
اتنا ہی سن لو کہ اس کے بعد سے میں پرماتما کو نہیں مانتا - اور تمام
عمر کبھی مانوں گا بھی نہیں ⁘

گانٹھیں

آج دو دن سے رُوپا بھوکی ہے۔ گھر میں ایک دانہ نہیں۔ اور مکان والی تین دفعہ آ کر اس سے کوٹھڑی خالی کر دینے کے لئے کہہ چکی ہے۔

رُوپا کو اپنی فکر نہیں۔ وہ تندرست اور نوجوان ہے۔ کم سے کم دو چار دن تو وہ بھوکی رہ ہی سکتی ہے۔ مگر بیمار اور بھوکی ماں کے لئے کیا کرے۔ اگر اکیلے اسے مکان چھوڑنے کا سوال ہوتا تو وہ شاید ہمت باندھ لیتی۔ آخر اتنے لوگ جو بے گھر دار کے ہیں اور دن بھر دروازہ دروازہ گھوم کر بھیک مانگا کرتے ہیں کہیں نہ کہیں رہتے ہی ہیں۔ اس لئے روپا کے دل میں اس کالی اندھیری اور زمین کی سطح سے بھی ایک فٹ نیچی کوٹھڑی اور اس کے غلیظ بہشت دالان کی کوئی کشش نہیں تھی لیکن وہ اپنی بیمار ماں کو کہاں لیجائے سڑک پر دن رات کف سے غرغر کرتی اور بخار سے تپتی ہوئی زندہ لاش کو ساتھ لے کر وہ کیسے رہ سکتی ہے ۔ کوٹھڑی کی جھرجھری دیواروں کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ کر جب اس کی ماں روٹی اور چٹنی مانگتی ہے تو وہ کیا کرے۔

آج چھ مہینے سے روپا پر یہ مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔ اپنے بچپن کا اُسے کچھ ہوش ہے ہی نہیں سنتی ہے کہ اس کا باپ یہاں کسی مِل میں کام کرتا تھا اور روپا کو چھ سال کی کر کے مر گیا۔ روپا کا ایک بھائی بھی تھا جو اس اندھیری کوٹھڑی کی نمکین سڑھی اور زہریلی ہوا میں تھوڑے ہی دن رہنے کے بعد چل بسا۔ بمبئی میں روپا کا باپ جس مل میں کام کرتا تھا اس میں آئے دن ہڑتالیں

ہوا کرتی تھیں - ایک دفعہ ہڑتال میں دوسری ملوں کے مزدوروں کو اپنی مل میں کام کرنے کے لئے آتے دیکھ کر روپا کا باپ اپنی مل کے تمیں ہڑتالیوں کے ساتھ پھاٹک پر لیٹ گیا تھا - پولیس کے نوجوانوں سے بھری ہوئی آدم خوار لاری ان سب کے اوپر سے ایک ساتھ نکل گئی تھی - روپا اس وقت چھ سال کی تھی - اس کی ماں آج بھی جب اپنے خاوند کی اس ہیبت ناک موت کا ذکر کرتی ہے تو اس کا رُواں رُواں کھڑا ہونے لگتا ہے - اور غصہ سے چہرہ جل کر سیاہ ہو جاتا ہے -

اس کے بعد رہ گئی روپا اور اس کی ماں -- پیٹ کے خندق کو کیسے بھرا جائے - یہ ایک اہم سوال بیٹی کے سامنے تو نہیں مگر ماں کے سامنے ضرور تھا - روپا کو یہ کبھی نہیں معلوم تھا کہ اس کی ماں کیسے اس کا اور اپنا پیٹ بھرتی رہی - دونوں اسی کوٹھڑی میں رہیں اور چڑ چڑی مکان والی کو کبھی بولنے کا موقع نہیں دیا - کرایہ پہونچنے میں کبھی دیر نہ ہوتی تھی - روپا کو بہت دن تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کی بیوہ ماں جو بالکل محنت اور مزدوری نہیں کرتی کہاں سے کما کر اسے اچھا کھانا اور کپڑا دیتی ہے اور خود بھی نفاست سے رہتی ہے - مگر عمر کے ساتھ ساتھ انسان کی اور خاص کر لڑکیوں کی سمجھ بڑھتی جاتی ہے - رفتہ رفتہ روپا بھی سب کچھ سمجھنے لگی -

اکثر راتوں کو اسی چھوٹی گندی اور بدبودار کوٹھڑی میں جب روپا کی آنکھ کھل جاتی تو وہ دوسری کھاٹ پر پڑی اپنی ماں کی طرف نگاہ دوڑاتی اور دیکھ کر خوف سے آنکھ میچ لیتی - اس وقت اسے لوگوں کا کہنا یاد آجاتا کہ

روپا کی ماں بُرا کام کراتی ہے۔ اس کی لاج شرم مر گئی ہے۔ روپا کی سمجھ میں یہ بھی آنے لگا تھا کہ یہی وہ برا کام ہے۔

اب تو روپا سولہ سال کی ہو گئی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی زندگی کی ساری خواہشات بیدار ہو جاتیں اور اسے اور بھی خوف زدہ کرتی رہتی ہیں۔ روپا نے ابھی ابھی صرف سال بھر پہلے تک ایسے ہی آنکھ میچ دینے والے منظر اس کی کوٹھڑی میں دیکھے ہیں۔ اور آج تو وہ انہیں دیکھتے رہنے کی عادی ہو گئی ہے مگر اس حالت کے دیکھنے سے وہ بے چین ضرور ہو جاتی ہے جوان ہوتے ہوئے بھی جوانی کی رنگین آنکھوں سے وہ اس کیفیت کو نہیں دیکھ سکی اور ہمیشہ اس سے ڈرتی اور سہمی جاتی رہی ہے۔

ادھر آٹھ مہینے سے یکایک روپا کی ماں بیمار ہو گئی ہے۔ روپا کو بیماری کی وجہ معلوم ہے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کام کی زیادتی ہی نے اس کی ماں کو سوکھا کر ہڈیوں کا ٹھٹھرا ہوا ڈھانچہ بنا دیا ہے۔ ماں کی بیماری میں روپا انتہائی محنت اور فرماں برداری سے خدمت کرتی ہے۔ روپا اب اتنا تو جان ہی لیتی ہے کہ جو ماں اسے پالنے پوسنے کے لئے اپنے تن کا بیوپار کرتی رہی ہے اور جوان لڑکی کو اپنے گاہکوں کی بری نظروں سے بچانے کیلئے اب تک برابر جان دیئے چلی جاتی تھی وہ اور چاہے جو بھی ہو ایک معمولی ماں نہیں ہے۔ ان آٹھ مہینوں میں روپا گھر کا سارا سامان بیچ کر ماں کی تیمارداری کرتی رہی پھر بھی وہ روز بروز پھیکی پڑتی جاتی تھی۔ ا۔ ب تو کچھ ہی دنوں کی مہمان معلوم ہوتی تھی۔

تو روپا کیا کرے۔ اور ماں کے لئے کہاں سے روٹی یا کم سے کم ٹنچی کا

انتظام کرے۔ روپا نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس کی ماں جیسے جیسے موت سے قریب پہونچ رہی ہے ویسے ہی اس کی بھوک اور پیٹ کی آگ بھی بڑھتی جا رہی ہے اور وقت پر اسے روٹی نہ ملے تو وہ کمزور اور بلکتی ہوئی آواز میں نہ معلوم کیا کیا بکا کرتی تھی وہ سب سن کر روپا کانپ جاتی تھی۔ کیا وہی ماں ہے یہ جو ایک رات اس گنہ گار کو اس کی چارپائی کی طرف بڑھتا دیکھ کر اس کی کمر سے لپٹ کر بولی تھی "تم میرے ساتھ جو چاہو سو کرو مگر اس لڑکی کی زندگی نہ تباہ کرو۔ آج آٹھ سال سے تم میرے یہاں آرہے ہو کچھ تو آدمیت کا پاس کرو۔ اسے اپنی ہی لڑکی سمجھو" ایسا کہتے کہتے جو پھوٹ پھوٹ کر جو رو پڑی تھی اور اسکے رونے کی درد بھری آواز سے روپا چونک کر جاگ اٹھی تھی۔ اور اس شرابی کو بھی جیسے کچھ حیا آگئی تھی۔ آج روپا کی وہی ماں جو اُسے اپنی زندگی کے کالے کالے اور بدبودار کیچڑ میں کنول کی طرح پاک رکھتی آئی ہے جب بھوک سے بے چین ہوتی ہے تو کہتی ہے "جاتی کیوں نہیں۔ اب تو کیا چھوٹی بچی ہے یا دنیا کی باتیں جانتی نہیں۔ کیوں نہیں کما کر لاتی۔ اور میرا پیٹ بھرتی۔ کیوں میں نے اپنا تن بیچ بیچ کر اس لئے پالا کہ تو ستونتی بنی بیٹھی رہے۔ اور میں بازار کی کتیا کی طرح ایک ایک سڑھی روٹی کے ٹکڑے کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دوں۔ جا۔ جا۔ باہر جا۔ یہاں اتنی جوانی اور خوب صورتی لئے کیوں پڑی رہتی ہے۔ یہاں کون آئے گا——"

روپا یہ سب سن کر سر نیچا کر لیتی ہے۔ دونوں آنکھوں سے ایک ساتھ گرم گرم دو آنسو گر پڑتے ہیں—— تو کیا اسے یہی کرنا ہوگا۔ شروع سے ہی

روپا دنیا میں جس کام کو برا سمجھتی آئی ہے اُسے تو وہ برا سمجھتی ہی رہی ہے۔ اب اُسے بھلا سمجھ کر کیا اس میں کودنا ہوگا۔ اس وقت اسے چاروں طرف سے ایک ایسا کھوکھلا پن گھیر لیتا جیسے اسے نگل جائے گا۔ وہ کیا کرے جس کام کے لئے اس کے اندر آج تک ایک بھی خواہش نہیں ہوئی وہ اسے کرنا پڑے گا۔ روپا بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کا جسم گویا اس کو کاٹ کھانے دوڑتا اور اس کی روح جسم سے نکلنے لگتی۔ پاس پڑوس میں وہ سب سے جتنا اُدھار اور رحم کی بھیک مانگ کر لے سکتی تھی لے چکی تھی۔ وہ کرے بھی تو کیا کرے محنت بھی وہ کون سی کرے گی۔ جو کھانے کے لئے کافی ہو سکے۔ کون اسے بتائے گا اور کام دے گا۔ پھر جس کی ماں ایسی رہ چکی ہو جو ایک مہلک مرض سے گھل گھل کر مر رہی ہو۔ اور جس کی بے شرمی کے چرچے چاروں طرف ہوا میں پھیلے ہوئے ہوں اسے کون اپنے مکان میں آنے دے گا۔ بمبئی جیسے بڑے شہر میں وہ جائے بھی تو کہاں جائے۔

روپا کی ماں نے آنکھیں کھولیں اور کروٹ لینی چاہی۔ دوڑ کر روپا نے ماں کو کروٹ دلا دی۔ ماں نے غصہ میں آ کر کہا روپا تو ڈھے جاتی کیوں نہیں گھر میں بیٹھے تجھے کون آکر دے جائے گا۔ ابھی تو تجھے باہر جانا ہی ہوگا اس کے بعد کہیں لوگ گھر میں آنا شروع کریں گے۔"

"مگر ماں میں کہاں جاؤں۔ میں تو باہر کے راستے بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتی۔ تم ہی تھیں جو باو کے مرنے کے بعد اتنے بڑے شہر میں رہ سکیں میں ہوتی تو اُسی دن گھر کو بھاگتی"۔

"تُو تو دودھ پیتی بچی ہے نا۔ میں نے بڑی غلطی کی جو تجھے یہاں شہر میں

پڑی رہی۔ میرے پاس اس وقت ایک پیسہ بھی تو نہیں تھا۔ کرایہ کے لئے روپیہ کہاں سے لاتی۔ جانتی ہے یہاں سے پچیس روپیہ لگتے ہیں پورے۔ اتنے روپیہ تو میں کبھی بھی جمع نہ کر سکی۔ پھر گھر جا کر بھی کیا کرتی۔ وہاں کون کھانے کو دیتا ــ جا ٹھو گھر سے باہر جا رہا۔ دیکھ اب میرا وقت قریب آپہونچا ہے ہر لمحہ خاتمہ کی طرف سرکتا جاتا ہے۔ میری کوئی مراد ادھوری نہ رہنے پائے۔ وہاں سے لوٹتی ہوئی مونگ کے پاپڑ اور بیسن کے سیو بھی لیتی آنا"۔

روپا کی آنکھیں اور کلیجہ بھر بھر آیا ــ اُف ــ اپنے افعال انسان کو کس قدر تباہ کر دیتے ہیں جس کے جینے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا اسے بھی زندگی کے ساتھ لگاؤ ہو جاتا ہے۔ آج روپا نے دیکھ لیا کہ اس کی ماں کی بدکاریاں سیاہی کی بوندیں بن بن کر اس کے چہرہ پر اتر آئی ہیں۔ مگر روپا کے سامنے وہی سوال پھر کھڑا ہو گیا ــ وہ کیا کرے۔ اس کا سویا ہوا دل کانپنے اور سہما جانے لگا۔ کیسے وہ باہر نکل کر جائے ــ اور تن کا سودا پکا کرے ــ زندگی کی ابتداء ہی سے وہ جسے بُرا اور ناپاک خیال کرتی آئی ہے، اور جس کے لئے اس کے دل میں پیسے اور آرام کی کسی طرح کی بھی خواہش نہیں اسی تاریک کنوئیں میں اسے ڈوبنا ہوگا۔ ساتھ ہی اسے اپنی ماں کے وہ دن اور اس تاریک کوٹھڑی کے وہ کپکپا دینے والے مناظر یاد آگئے جنھیں دیکھ کر وہ خوف سے آنکھیں میچ لیا کرتی تھی۔ بچپن ہی کمسنی ہی سے وہ اس طرح آنکھیں میچتی چلی آئی ہے اور آج اسے آنکھ کھول کر اس کریہہ اور شرمناک فعل کا مرتکب ہونا پڑے گا۔ مرتی ہوئی ماں کے پیٹ کی آگ میں وہ کیا جھونک دے کہ اس کی ساری جلن ٹھنڈی ہو جائے۔

اپنے اندر انسانیت کی ایسی ہی جلتی گھٹتی آنچ لے کر روپا باہر نکل آئی۔ ماں کو اُس نے اچھی طرح سے کپڑا اُڑھا دیا تھا۔ اور حسرت آمیز نظروں سے اسکے چہرہ کی طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی ماں اتنی کمزور تھی کہ اپنے چہرہ پر بیٹھی ہوئی مکھیوں کو بھی نہیں اڑا سکتی تھی۔ شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی میں پڑا ہوا ایک مہلک مرض کا شکار کچھ دن اور اس طرح اپنے کو زندہ رکھنے کی خواہش میں سسک رہا تھا۔ روپا کوٹھڑی کا دروازہ اچھی طرح بند کر کے باہر آئی۔ اپنی جیسی کتنی ہی کوٹھڑیوں کے سامنے سے گذرتی ہوئی جس میں قسم قسم کی بیماریوں کی شکار عورتیں، بے کار اور اپاہج مزدور، گرہ کٹ بھیک منگے اور پیشہ ور آوارہ رہتے تھے وہ سڑک پر آگئی۔ اس سے پہلے وہ بہت کم نکلی تھی۔ اور ادھر آئے ہوئے اسے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ لوگ روپا کو دیکھ کر ایسے کھلے ہوئے اور شرمناک اشارے کرنے شروع کئے جنہیں دیکھ کر اور سمجھ کر روپا کو قے سی ہونے لگی۔ زندگی کا یہ گندہ اور ناپاک پہلو تو آج ہی روپا کو نظر آیا تھا۔

سڑک پر آتے ہی روپا گھبرا گئی۔ بمبئی شہر کی چہل پہل اور شور و غل گویا اسے کاٹ کھانے لگا۔ شام ہونے کو ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ ہنگاموں اور چیخ و پکار سے بھرا ہوا شہر روپا کو ایک مہلک مرض سے سسک سسک کر روتا ہوا معلوم ہوا جس میں اُسے غریبوں کی گھٹی آہیں سنائی دے رہی تھیں۔ دونوں جانب آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں سڑک پر بجلی کے قمقموں کی قطاریں جو اب جلنا ہی چاہتی تھیں۔ گذرتے ہوئے عورتیں اور مرد جن میں دولت اور طاقت کے غرور میں مست وہ لوگ بھی تھے جنہیں دنیا کے غم نے چھوا بھی نہیں تھا

دوسری طرف چیتھڑوں میں لپٹے اور سہمی سہمی آنکھیں زمین میں گاڑھے ہوئے وہ بھی تھے جن کے لئے پیٹ اور صرف پیٹ کا ہی سوال تھا جن کے لئے دنیا ایک بیحیائی کی منزل تھی۔ اور جو کفن کے پیسوں کے لئے جوتیں چھوتے تھے روپا بھی سب دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ دُور سے ایک بڑا پارک دکھائی دیا۔ وہ کچھ تیز جانے لگی۔ پارک کے پاس آکر وہ کچھ ٹھٹکی۔ ماں نے اسی پارک کا ذکر تو نہیں کیا تھا۔ ضرور کیا ہوگا۔ یہی تو گھر سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس نے پارک کے اندر دیکھا۔ لانوں پر بچے کھیل رہے تھے پورے پارک میں ایک میلہ سا لگا ہوا تھا۔ سبھی عمر کی عورتیں اور مرد ہر قسم کے خیال لے کر وہاں چل رہے تھے۔ اوپر سے سب کے چہروں پر وہی تیکھی بشاشت اور بناوٹی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

روپا پارک کے اندر داخل ہوئی اور اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی وہ سیدھی اُدھر چلی گئی جدھر بہت سی بنچیں پڑی تھیں۔ اگرچہ وہاں سات آٹھ بنچیں تھیں مگر وہ سب کی سب خالی تھیں۔ روپا ان میں سے ایک پر جاکر بیٹھ گئی۔ بیٹھی بیٹھی وہ نہ جانے کتنی باتیں سوچ چکی۔ ادھر اندھیرا پھیلتا گیا۔ سڑکوں پر سے گذرنے والوں کا سایہ کہیں کم اور کہیں زیادہ تھا۔ اور کہیں بہت ہی گہرا۔ بجلی کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ روپا اسی طرح بیٹھی رہی یہ بھی ایک اتفاق کی بات تھی۔ روپا کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ جن بنچوں کے بیچ میں آکر بیٹھی ہے وہاں صرف بگڑی ہوئی لڑکیاں اور ڈائنیں آکر بیٹھتی ہیں جو مردوں کی گھات میں گھوما کرتی ہیں۔ ایک اتفاق ہی کی بات تھی جو روپا وہاں آکر بیٹھ گئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اور سامنے کی جھیل کی طرف دیکھتے دیکھتے اسکی

آنکھوں میں ایک سہانی ٹھنڈک چھاگئی۔ وہ کچھ اونگھنے لگی۔ اس کی آرزوں اور تمناؤں نے ایک سنہرا تانا بانا بنانا شروع کیا۔ گویا وہ زندگی کی راہ میں مطمئن اور بے فکر اپنے مقام کو جانتی پہچانتی آگے چلی جا رہی ہے۔ اسے اپنی زندگی کا ایک سیدھا راستہ مل گیا ہے۔ اس کا آدمی ہے جو محنت مزدوری کر کے روپیہ دو روپیہ روز کما لیتا ہے۔ روپا اس منحوس شہر کے باہر ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہتی ہے اسکے پھول جیسے دو بچے ہیں اور اپنے ان لالوں کو لے کر خوشی خوشی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اسے کسی چیز کی ہوس اور خواہش نہیں ہے۔ اس کا آدمی کبھی کبھی شراب پی کر اسے مارتا پیٹتا بھی ہے۔ اور بعد میں ہوش آجانے پر اور دل و دماغ کا نشہ اتر جانے کے بعد اس سے ویسا ہی پیار کرنے لگتا ہے۔ ایک خیالی دنیا میں روپا کھوئی جا رہی تھی۔ اس کی ماں کبھی کا مر چکی ہے۔ مرتے مرتے اپنے انعال کی تاریکیاں اس کی چاروں طرف چھوڑ گئی ہے۔ یہی روپا کی روح میں ایک کھٹکنے والا کانٹا ہے لیکن وہ ہے تو اسکی ماں ہی۔ اُس نے اسے اپنے پیٹ میں رکھ کر اور اپنے گوشت اور خون سے سینچ سینچ کر بڑا کیا تھا۔ روپا نے بڑی بڑی گھرائی ہوئی آنکھیں کھول کر پھر ایک بار جھیل کی طرف دیکھا۔ کیا ایسے دن کی ٹھنڈک نصیب میں نہیں لکھی ہے۔ آج وہ جس راستہ پر پیر رکھنے آئی ہے اس میں تو بازاری لوگوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے اور روتے جھینکتے ہی زندگی بسر ہوگی۔ بعد میں اس کی جو کچھ حالت ہوگی وہ بھی تو وہ جانتی تھی۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایشور نے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھ دیا ہے وہ اس سے تو بھاگ نہیں سکتی۔ پھر اس کا کیا ہوگا۔ وہ بھی ایک دن اپنی لڑکی کو ایسا ہی برا کام کرنے کے لئے بازار

نہ بھیج گی ۔ روپا ایک زبردست بوجھ سے دبی جا رہی تھی ۔ ایک خیال کی جستجو جتنی میٹھی تھی دوسری اتنی ہی کڑوی ۔ جیسے ہلاہل ۔ آخر وہ بھی اپنی ماں کی طرح مرنے کی کوشش کر کے بھی مر نہ سکے گی ۔ موت سے بھی زیادہ ہیبت ناک اور کاٹنے والی چیز دل میں لئے اُسے مٹ مٹ کر جینا ہوگا ۔ زندگی بیماریوں کا گھر بن جائے گی جن کی آگ دہکے گی ۔ اور شاید جسم بھی بیماری زخموں اور درد کی تکلیف سے جلا کرے گا .... روپا اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکی اسے اس راستہ پر نہیں جانا ہے ۔ یہ تو بڑا ہی ٹیڑھا اور ایشور کی مرضی کے خلاف ہے ۔ اسی لئے تو وہ ایسے کام کرنے والوں کو اس قسم کی سزائیں دیتے ہیں ۔ پہلے تو ضرور کچھ مزہ آتا ہوگا جیسے مواد بھرے ہوئے پھوڑے کو ہلکے ہلکے چھونے سے آرام ملتا ہے ۔ ایک قسم کا عارضی آرام جو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ مگر بعد میں جب وہی پھوڑے دہک دہک کر پھوٹتے ہیں تو کیسی اذیت ہوتی ہے ۔

تو پھر روپا کیا کرے ۔ کہاں ڈھونڈے وہ زندگی کا ایک ساتھی جو اس کی ناؤ کو طوفانی موجوں سے پار لگانے کا ذمہ لے ۔ کون ایسا ملے گا جو اسے اپنی بیوی بنا کر رکھے گا ۔ اور اس کا ہو کر رہے گا جس کی چھاتی کے گھونسلہ میں چڑیا کی طرح ڈبکی لگا کر وہ اپنی زندگی کاٹ سکے ۔ ماں تو اب چند دنوں کی مہمان ہے ۔ اس کی موت کے بعد کیا ہوگا ۔ اس خیال سے وہ گھبراتی ہے ۔ اور اس کی کالی گٹھری کچھ دنوں اور اٹھائے رہنا چاہتی ہے ۔ مگر کہاں ملے گا روپا کا خاوند ۔۔ جو اس سے رشتہ کرلے نہیں تو روپا ایسے ہی تمام عمر اس کا انتظار کرتی رہے گی لیکن وہ

اپنے ہونے والے شوہر کو دھوکہ نہیں دے گی۔ آخر وہ اپنے شادی شدہ باپ کی بیٹی ہے۔ اگر وہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوتی تو اس کا راستہ صاف تھا پھر وہ جدھر سے آئی تھی ادھر ہی جاتی مگر وہ تو سچے باپ کی لڑکی ہے۔ آج وہ دوزخ یا جنت جہاں کہیں ہو اسکے ایسے افعال سے کتنا صدمہ نہ ہوگا کیسے وہ اس کی روح کو اذیت پہونچا سکے گی۔ وہ بھوکی مرجائے گی۔ وہ مزدوری کرے گی۔ وہ نالی اور پاخانے صاف کرے گی۔ مگر یہ سب تو اسکے کئے نہ ہوگا۔ وہ کھلونا بن کر بگڑے دل آوارہ لوگوں کی دل بہلائی کا سامان نہ بن سکے گی اسے جینا ہے۔ اور بے شک جینا ہے لیکن وہ اونچے جھوں لے کر ہی جئے گی۔ اپنی عصمت کھو کر وہ جی نہ سکے گی۔ وہ خون اور گوشت کی بنی ہوئی ہے۔ جو مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے۔ مگر اس وقت تو وہ گوشت اور لہو ہے۔ مٹی اگر اپنی آبرو نہ بچا سکے تو کیا۔ گوشت تو اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہے۔ روپا سوچتے سوچتے تھک گئی۔ اسکے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ وہ اپنے ہی جسم سے لپٹ کر خوب جی بھر کر رولے۔ روپا بے چین ہو گئی۔ اور ادھر ادھر کی باتوں پر پھر سوچ بچار کرنے لگی۔ وہ لوٹ جائے گی۔ اور جا کر ماں سے کہے گی۔ نہیں ماں تو مرجا۔ کل مرتی ہو تو آج ہی مرجا لیکن مجھے زندہ رہنے دے۔ اپنی نگاہ اور اپنے افعال دونوں میں ....

اچانک اسکے کندھے پر کسی نے آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا ایک آوارہ سا چھوکرا کھڑا تھا۔ چہرے پر شہدا پن اور آنکھوں میں مستی۔ بالوں سے تیل بہہ بہہ کر چہرے پر آگیا ہے۔ پان کی لالی ہونٹوں پر

کالی پڑگئی ہے۔ ہاتھ سے گھڑی باندھے روپا کو دیکھ رہا ہے۔

"چلو گی میرے ساتھ" اس نے روپا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا یہیں پاس ہی تو میرا گھر ہے۔ تم روز تو یہاں دکھائی نہیں دیتیں۔ آج پہلی مرتبہ آئی ہو شاید۔ مگر اتنی اداس کیوں ہو۔ کیا ابھی رو رہی تھیں۔ دیکھو میرا نام ہے احمد۔ میرے رہتے تمہیں کوئی کچھ نہ کہہ سکے گا۔ تم چلو میرے ساتھ۔ بولو کیا لو گی "۔

ایک سانس میں کمبخت اتنی باتیں کہہ گیا "۔ مگر میں نہیں جاؤں گی۔ میں کسب نہیں کروں گی" یہ کہہ کر روپا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔ اور تیر کی طرح گھر کی طرف چل پڑی۔ پارک سے باہر نکل کر سڑک پر آتے ہی اس نے یہ طے کر لیا کہ وہ بھیک مانگے گی اور اس سے جو کچھ ملے گا اس میں اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ بھرے گی اس نے دوکانوں کے سامنے جا جا کر مانگنا شروع کیا۔ جن لوگوں نے روپا کو دیکھا اُن کی نگاہوں کا مطلب روپا سمجھتی تھی مگر وہ مجبور اور لاچار ہو کر اسی طرح مانگتی چلی گئی۔ کسی نے ایک پیسہ بھی نہیں دیا۔

وہ ایک اُدھیڑ مارواڑی بوڑھے نے اسے دیکھ کر یہ بھی کہا "اری اتنی تیار ہو کر کیوں بھیک مانگتی ہے۔ کوٹھا لے کر کیوں نہیں بیٹھ جاتی۔ مگر کام تکلیف کا ہے۔ جا جا تجھے کون بھیک دے گا۔ محنت مزدوری کر" روپا یہی سب سنتی گھر آئی۔ ایک ایک کوٹھری کے سامنے رک کر اس نے اندر نظر ڈالی۔ شاید کسی کے چہرے پر محبت کے آثار دیکھ کر وہ اپنی ماں کے لئے دو چار پیسے مانگ لے۔ ابھی اُسے کوئی فکر نہ تھی۔ وہ ابھی چار دن اور بھوکی رہ سکتی ہے۔ ایک کوٹھری کے سامنے اس نے جو دیکھا اس سے اُسکی آنکھیں

پھر ایک بار بھیچ گئیں۔ اپنی کوٹھری کے سامنے آکر اس نے بھڑا ہوا دروازہ کھولا۔ نیچے اندھیرا چھایا تھا۔ پڑوس سے دیا سلائی مانگ کر کپی جلائی۔ ماں کو دیکھا۔ ماں کی آنکھیں کچھ ٹھنڈی سی تھیں۔ سانس بہت آہستہ چل رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی ایسی خطرناک حالت نہیں دیکھی تھی۔ قریب جا کر روپا رونے لگی اور ہلا کر بولی "ماں۔ ماں" ماں —— خاموش تھی۔

پھر اس نے بڑی زور سے ہلایا۔ اب ماں کی آنکھیں بند ہوگئی تھیں روپا ماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اٹھا کر اُسے غور سے دیکھا۔ ابھی موت کی سیاہی چڑھ رہی تھی روپا کانپ اٹھی۔ اس کی ماں آج اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلی جا رہی ہے دنیا میں کیا اس کا اب کوئی بھی نہ رہ جائے گا۔ اس کی ماں نے مونگ کے پاپڑ اور بیسن کے سیو کے لئے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ وہ اس کیلئے اتنا بھی نہ کر سکی۔ سولہ سال کی وہ تندرست نوجوان اور خوب صورت لڑکی کہیں سے بھی چار پیسے نہیں لا سکی۔ پھٹکار ہے اس کی زندگی پر۔ اس کی جوانی پر۔ روپا برابر روئے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو ٹپ ٹپ گر کر اس کی مرنے والی ماں کے مردنی چھائے ہوئے چہرہ کو تر کر رہے تھے۔ بہت زیادہ ٹھنڈک پہونچنے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے روپا کو دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی اور پھر ہاتھ منہ کے پاس لے جا کر اشارے سے پوچھا کچھ کھانا لائی ——

روپا کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جیسے کوئی گرم انگاروں پر گھسیٹنے لگا۔ کمزوری کی وجہ سے ماں کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ ہاتھ بھی ایک مرتبہ منہ تک

جاکر اور اشارہ کر کے رہ گئے تھے - روپا نے کہا — ماں — ماں — تمہیں مرنا تو ہے ہی مگر تم ایک گھنٹہ اور جیو نا - میرے لوٹ آنے تک تم زندہ رہو۔ اس کے بعد چاہے تم مر جانا - کیا میرا اتنا کہنا نہ مان سکو گی - میں جاتی ہوں اور ابھی آتی ہوں - جیسے بھی ہوگا میں تمہارے لئے کھانا لاؤں گی - تم کچھ دیر اور بھوک سے جی بہلا لو - اگر میں اب کی دفعہ بھی خالی ہاتھ آئی تو اس گوشت پوست سے بنے ہوئے جسم پر تیل الٹ کر آگ لگا لوں گی - ماں تم رکی رہنا - میں جاتی ہوں - مجھ سے بڑی غلطی ہوئی - میں ایک بار پھر لوٹ گئی مگر اب کی دفعہ ایسا نہ ہوگا - میں اپنے جسم پر ہر قسم کی زبردستیاں برداشت کر کے اپنی ساری عصمت ایک ساتھ کھو کر بھی تمہارے لئے کھانا لاؤں گی - مجھے کتے کو بھی اپنا تن دینا پڑے تو منظور ہے - تم میری کمزوری کیلئے مجھے معاف کرو ماں - میں سب کچھ کھو کر بھی تمہیں نہیں کھو سکتی - تم میری ماں ہو - میرا تمہارا امر رشتہ ہے

ماں نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں - روپا کو اب کی بار ان میں زیادہ — پہلے سے دوگنی ناامیدی دکھلائی دی - ایسا معلوم ہوا جیسے بھوک ماں کے جسم کا ایک ایک ٹکڑا کر کے کھائی جا رہی ہے - ماں دنیا سے اپنے کو بچانے کے لئے آنکھوں میں حسرت اور یاس کا ایک ایک دریا بھرے رو رہی ہے سچ ہے ماں کی آنکھیں رو رہی تھیں - مگر سارے آنسو خشک تھے - اس دل ہلا دینے والے منظر کو دیکھ کر بھی آنکھوں سے دو بوند آنسو نہ گر سکے تھے - ایسی خوفناک خشکی تھی ان آنکھوں میں - روپا دروازہ بند کر کے باہر آئی چلتی دوڑتی اس پارک کی طرف لپکی - سات بج رہے تھے - اس وقت اور بمبئی کی سڑکیں

ویسے ہی گلزار بنی جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔ روپا کو تو ادھر اُدھر دیکھنے کی فرصت بھی نہیں وہ سیدھی ساون بھادوں کی گھٹا کی طرح اڑتی چلی جا رہی تھی اسے جلد ہی وہاں پہونچنا تھا۔ اگر اس کے پر لگ جاتے تو کیا ہوتا۔ اس نے اب کی بار سڑک سے گذرتے ہوئے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ نہیں وہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ جانور نہیں ہے۔ انسان ہے وہ۔ وہ محنت کرکے پیسہ لائے گی۔ اور اس محنت کی آج سے ابتدا ہو جائے گی۔ دنیا دیکھے۔ اس کی ماں دیکھے کہ روپا کی بھی کوئی ہستی ہے۔ وہ ناچیز نہیں ہے۔ اسکی ماں پھر بچ جائے۔ پھر وہ کہے گی ماں تم نے زندگی بھر مردوں کا ظلم اپنے جسم پر برداشت کیا اب میری باری ہے۔ میں تیار ہو کر آئی ہوں۔ اب تم آرام کرو۔ اور میں اب تمہیں کما کر کھلاؤں۔ وہ ساری کمزوری جو اسے گھنٹہ بھر پہلے گھیری ہوئی تھی بے کار تھی نیکی، بدی، اچھا، بُرا یہ سب امیروں کے چونچلے ہیں۔ وہی ان کے بھید جاننے کا دم بھرتے ہیں۔ غریبوں کے لئے ایک ایک روٹی کے لئے دم توڑنے والوں کے لئے ان کی کوئی قیمت نہیں ہے ان کے لئے سب سے بڑا سوال ہے اپنا اور اپنوں کے پیٹ کا خندق بھرنا جو اپنے اس فرض کو بھولتا ہے وہ گنہ گار ہے۔ اس کی یہ دنیا اور وہ دنیا دونوں بگڑتے ہیں۔ تیزی سے بڑھتی ہوئی روپا پارک میں داخل ہو گئی مگر غلطی سے جدھر پہلے بیٹھی تھی ادھر نہ جا کر دوسری طرف چلی۔ ایک بنچ پر ایک شوقین کو بیٹھا دیکھ کر اسی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ چپ چاپ اس نے بھیگی ہوئی پلکیں پونچھ ڈالی تھیں۔ اور چہرہ پر بناوٹی مسکراہٹ لا کر پیچھے سے گھوم کر سامنے جا کھڑی ہو گئی۔ اور تھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔

"چلیے گا"

کچھ پریشان ہو کر انھوں نے کہا "کہاں"۔

"یوں ہی۔ کہیں۔ جہاں آپ لے چلیں میں تیار ہوں"

کچھ خوبی کے بزرگ تھے وہ بھی بولے ـــ "میں تمہیں لیجا کر کیا کروں تمہیں تو میں نے پہلے دیکھا بھی نہیں"۔

"وہی جو ایک مرد ایک عورت کے ساتھ کرتا ہے۔ چلئے اٹھئے۔ میں تیار ہوں آپ کے ساتھ چلنے کے لئے میری طبیعت بھڑک اٹھی ہے دیر نہ کیجئے"۔

"دور ہو کمینی عورت سامنے سے۔ یہاں آکر بھلے آدمیوں پر ڈورے ڈالتی ہے۔ شریفوں کے لڑکوں کو ایسی ہی "فرلٹ" (   ) خراب کرتی ہے۔

فوراً چلی جا نہیں تو ابھی پولیس والے کو بلاؤں گا۔ ساری بدمعاشی دور ہو جائے گی"۔

روپا خاموش پتھر کی مورت بن گئی۔ کھڑی کھڑی ٹک ان کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ پھر سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور روپا اب کیا کرے یہی سوچنے کے لئے کچھ دور سامنے ہی گھاس پر دھم سے بیٹھ گئی +

سکھیا

"سکھیا کہاں جا رہی ہو"

"گوپوجن" کے میلہ پر۔ ماں جی"

"تو نے آج پھر مانگ میں سیندور لگا رکھا ہے۔ میں نے کتنی ھی بار تجھ سے ایسا کرنے سے منع کیا ہے! تو میرے کہنے پر کیوں نہیں چلتی"

رامو کی آواز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُسے غصہ آگیا ہے۔

بھولی بھالی سکھیا نے معصومیت سے پوچھا "میری سب سہیلوں نے آج نئے نئے کپڑے پہنے ہیں اور اپنی مانگ میں سیندور بھی لگایا ہے اگر میں نے لگا لیا تو کیا ہوا ماجی"

"ھزاروں مرتبہ سمجھانے پر بھی یہ مانتی نہیں۔ کیسی ناوان ہے۔ میں نے جو کہہ دیا تم سیندور نہیں لگا سکتیں تم پھر یہ سوال کیوں کرتی ہو۔ ماں کا کہنا ہے۔ ماں کے کہنے کو مانو۔ تم بیوہ ہو۔ بیوہ اپنی مانگ میں سیندور نہیں لگاتی"۔

ماں کے تمتماتے چہرے کو دیکھ کر سکھیا ڈر رہی تھی۔ وہ کانپ اٹھی۔ وہ بیوہ ہے اس لئے اپنی مانگ میں سیندور نہیں لگا سکتی۔ بیوہ کون ہوتی ہے بیوہ نے کیا قصور کیا ہے کہ جس کا صلہ مجھے اس طرح بھگتنا پڑ رہا ہے۔

وہ ماں سے زیادہ پوچھنے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اندر گئی اور سیندور صاف کر کے سہیلیوں کے ساتھ میلہ چلی گئی۔ لیکن اس کے دل میں ایک کانٹا تھا۔ جسے وہ ضرور نکالنا چاہتی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ بیوہ عورت کون ہے۔ کیوں سیندور سے بیوہ کی مانگ کو محروم رکھا جاتا ہے"

میلہ جاتے ہوئے راستہ میں اس دن سکھیا نے اپنی ماں کی ساری باتیں اور سیندور کا قصہ اپنی سہیلیوں سے کہہ سنایا اور پوچھنے لگی کہ "بیوہ" کس کو کہتے ہیں۔ آج بیوہ کہہ کر میری ماں نے میرا سیندور نکلوا دیا ہے۔

ایک نے کہا — "سکھیا تم بیوہ کا مطلب پوچھ کر کیا کرو گی"۔

"کچھ نہیں۔ یہی تو جاننا چاہتی ہوں کہ آخر میری ماں نے مجھے کیوں ایسا کرنے سے روکا۔ تم سب کو تمہاری ماؤں نے کیوں نہیں منع کیا۔ میری ماں تمہاری ماؤں سے زیادہ سخت برتاؤ کرتی ہوگی"۔

دوسری نے کہا — "سکھیا تمہاری ماں بڑی چالاک ہے۔ وہ کبھی اپنی لڑکی سے سخت برتاؤ نہیں کر سکتی۔ تم اس کے کہنے پر چلا کرو۔ جیسے وہ کہے ویسا کیا کرو۔ بیوہ کا مطلب سمجھنے کی چکر میں نہ پڑو"۔

سکھیا کے بہت عاجزی منت کرنے پر ایک نے کہا — "سکھیا بیوہ اس عورت کو کہتے ہیں جس کا شوہر مر گیا ہو — جس عورت کا خاوند مر جائے اسے ہمارے سماج کے قانون کے مطابق مانگ میں سیندور نہیں لگانا چاہئیے۔ سیندور سہاگ کی نشانی ہے۔ تمہارا شوہر مر چکا ہے۔ اس لئے تمہاری ماں نے تمہیں ایسی مانگ بنانے سے روکا ہے"۔

"میرا شوہر مر چکا ہے۔ وہ کب شوہر بنا تھا اور کب مر گیا۔ سکھیا یہی

سوچ رہی تھی - جہاں تک اسے یاد تھا اس کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تھی پھر شوہر کیسے مر گیا - اور وہ بیوہ کیسے ہو گئی - یہی خیال بار بار اس کے دل اور دماغ میں چکر لگا رہا تھا -

سنبھل سنبھل کر بولی —— "میری تو بہن ابھی شادی ہی نہیں ہوئی پھر میرے شوہر کیسے مر گئے - میں تو اپنے ہونے والے شوہر کے لئے دل ہی دل میں ہزاروں منتیں مانگا کرتی ہوں"۔

بڑا کٹھن سوال تھا لیکن سکھیا کی دوشیزگی پر رحم کھاتے ہوئے اور اس کا شک دور کرنے کیلئے اس کی سہیلیوں نے اسے سارا قصہ کہہ سنایا کہ وہ کیسے سات برس کی عمر میں ہی ایک مالدار کے لڑکے سے بیاہی گئی تھی اور کس طرح اس کا شوہر چار پانچ مہینوں کے بعد ہی مر گیا تھا اسے بیوہ کر کے!

اس دن میلہ میں اس کا دل بالکل نہیں لگا - وہ جیسے سمندر کی موجوں سے ٹکرا رہی تھی - میلہ سے لوٹ کر سیدھی گھر گئی اور ماں سے پوچھی —— "ماں جی —— کیا میرا بیاہ ہو چکا ہے - اب میرا بیاہ نہیں کرنا ہے! کیا سچ مچ میں بیوہ ہوں - کیا اس لئے آج تم نے مجھے سیندور لگانے سے منع کیا تھا"۔

رامو کا ماتھا ٹھنکا - وہ کچھ بول نہ سکی - آج سے ایک اور قسم کی پریشانی بڑھ گئی - وہ اپنی لڑکی سے اصل واقعہ کب تک چھپا سکتی تھی - سکھیا اب چودہ پندرہ برس کی دوشیزہ تھی - وہ بیوہ کے مطلب کو سمجھ گئی تھی - اس کی سہیلیوں نے اسے سب کچھ معلوم کرا دیا تھا - اسلئے

ماں نے بھی آج دبی زبان سے کہا" تو جو کہتی ہے وہ ٹھیک ہے۔ تو بیوہ ہے"۔

خدا نے حسن کی دولت تقسیم کرتے وقت سکھیا کو مالامال کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا ہی خوب صورت اور ہنس مکھ تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں ہرن کی آنکھوں جیسی لمبے لمبے گھونگروالے بال اس پر گٹھا ہوا جسم اور ایک خاص قسم کا اضافہ ہی تو تھا۔ وہ جب کبھی قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر گیسو سنوارتی تو اپنی قسمت پر گرم گرم آنسو بھی بہایا کرتی تھی۔ اپنی سکھی سہیلیوں کو شوہر کی محبت اور خدمت میں محو دیکھ کر خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتی۔ اس کی اپنی زندگی دوبھر معلوم ہو رہی تھی۔ وہ گھل گھل کر مر رہی تھی۔

ایک دن جب اسکے بھائی نے اپنی بیوی کے لئے پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈالا تھا اور پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا تو وہ چھپ کر سب کچھ دیکھ چلی تھی۔ اس کے دل میں بیوہ کی بےبسی طوفان بن کر اٹھ رہی تھی۔ وہ سماج کو کوس رہی تھی۔ اپنے کمرے کے کواڑ بند کر کے خوب روئی تھی۔ اپنے دل کے سمندر میں بہتی ہوئی محبت کی ناؤ کا کوئی کھیوانہ پاکر وہ پاگل سی ہو گئی تھی۔ وہ بھی دوسری دوشیزاؤں سا جسم اور انہیں کے دل جیسا دل رکھتی ہے۔ کھاتی ہے اور پیتی ہے۔ اس کے دل میں بھی تو محبت کا پودا موجود ہے۔ اسے کھلنے پھولنے کیوں نہیں دیا جاتا۔ اس کی کم عمری میں جب وہ سات آٹھ برس کی تھی کیوں بیوہ بنا دیا گیا تھا اسے۔ سکھیا ان ساری باتوں پر کتنی کتنی دیر غور کرتی اور آخر رو دھو کر چپ رہتی۔

کتنی ہی بار شادی بیاہ کی رسموں میں اسے شامل ہونے کا موقعہ ملا تو اسکا دل دہل گیا تھا۔ وہ سہم کر رہ گئی تھی۔ وہ اس ریت اور اپنے سماج کے

خلاف جنگ کرنا چاہتی تھی۔ مگر افسوس عورت کا کمزور دل ـــــ وہ ایسا کام نہ کر سکی۔

اس دن کو وہ بھلا نہیں سکتی جب وہ سر دھو کر چھت پر بال سکھانے گئی تھی۔
اس دن ہاں! اس دن دوسری چھت پر ایک نوجوان کھڑا ٹکٹکی لگا کر اسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر دیکھتا رہا اور اشارے ـــــ محبت آمیز اشارے ـــــ بھی کرتا رہا ـــ نہ جانے وہ سکھیا کبھی اس کی طرف بڑی گہری نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ گویا اس کی آنکھوں میں وہ نوجوان جچ گیا تھا۔ بال سکھاتے سکھاتے دونوں کے دل کتنی جلد مل گئے تھے۔

وہ ہر روز ٹھیک وقت پر چھت پر جاتی اور اسے دیکھا کرتی۔ جی بھر کر دیکھتی وہ بھی محبت اور حسن کی پوجا کیا کرتا۔ کبھی نہ کبھی وہ چھپ کر کسی نہ کسی جگہ ایک دوسرے سے مل بھی لیا کرتے۔ ڈوبتی ہوئی ناؤ کو سہارا مل گیا تھا۔ محبت کا آسرا پاکر سکھیا کی بےچینی کم ہونے لگی۔ وہ تن من سے موہن کی ہو گئی تھی۔

موہن بھی سکھیا پر لٹو ہو گیا تھا۔ اس نے اسے چھوٹی سی عمر سے لے کر جوان ہونے تک دیکھا تھا۔ وہ سکھیا کو حاصل کر کے بہت خوش تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ گھپ اندھیرا تھا۔ سکھیا اور موہن گلی سے آہستہ آہستہ باہر جا رہے تھے۔ اندھیاری رات ان کی بےبسی کے سوگ میں کالی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کتے کبھی کبھی بھونک دیا کرتے تھے۔ گویا ان کی روحوں کو جگا رہے ہیں۔ وہ جا رہے تھے۔ نہ معلوم۔ مقام کی طرف ـــ کہیں دور بہت دور ـــــ اپنے شہر سے بہت دور نکل گئے ایک جگہ ڈیرا ڈالا۔ اچھا گاؤں تھا۔ دونوں وہاں ایک دوسرے کی محبت کا مزہ چکھ کر نہال ہو گئے تھے۔

سکھیا موہن کو پاکر ایسا محسوس کرنے لگی گویا اس کی زندگی سکھوں سے مالامال ہوگئی ہے۔ اس کی اجڑی ہوئی محبت کی بستی نئے سرے سے آباد ہوگئی ہے۔ وہ محبت کا رس پی رہی تھی۔

کتنے ہی دن بیت گئے۔ جو رقم وہ دونوں اپنے ساتھ لائے تھے وہ ختم ہوگئی۔ پیٹ کی آگ سجھانی ہے اور اس آگ کو بجھائے بغیر محبت کا کیا مزہ آسکتا ہے۔ موہن نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے لیکن کام بنتا دکھائی نہ دیا۔ تھک کر بیٹھ گیا۔ دو دن بڑی مشکل سے کاٹے۔ ایک روز تو بھیک مانگ کر پیٹ بھرنا پڑا۔

موہن اور سکھیا رام پور میں نو وارد تھے۔ رام پور کے لوگ ان کو شبہہ کی نظروں سے دیکھا کرتے۔ ایک سیدھے سادھے گاؤں میں بیسویں صدی کے فیشن ایبل جوڑے کو دیکھ کر گھر گھر چرچے ہوا کرتے تھے۔ جہاں دس پانچ آدمی بیٹھا کرتے سکھیا ہی کی باتیں ہوتیں۔ اس کے حسن رنگ اور بڑی بڑی آنکھوں کا ذکر رہا کرتا کوئی کہتا —— موہن اُسے بھگا کر لایا ہے" کوئی کہتا —— "ایک دوسرے کے عاشق ہوں گے"۔ شہر کے غنڈوں کی بھی ان پر کڑی نظریں رہتیں۔ وہ بھی ان کا کتنی کتنی دیر پیچھا کیا کرتے تھے۔ انھوں نے ان کا ٹھکانا دیکھ رکھا تھا۔

ایک رات غنڈوں نے حملہ کرکے سکھیا کو سوتے میں اٹھا لیجانے کی ٹھانی۔ اندھیری رات تھی۔ کوئی بارہ بجے تھے۔ چار غنڈے انکے چھوٹے سے مکان میں گھس پڑے۔

موہن جاگا اور سکھیا بھی جاگ گئی۔ ایک طرف لٹھ ہتھیار لئے ہوئے

غنڈے اور دوسری طرف ہنستا موہن۔ موہن خون میں نہا کر دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس کے جسم سے روح نکلی جا رہی تھی۔ سکھیا کے غم میں اُن کی تاریکی اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ کہیں کہیں سے کتے اس کی چیخ پکار سن کر بھونک دیتے تھے۔

لاہور کا ڈبی بازار ویشیاؤں کا بازار ہے۔ وہاں کے ایک کوٹھے پر ایک نئی ویشیا آئی تھی۔ اس کے رنگ روپ کا کافی چرچہ تھا۔ وہ ایک نوجوان دوشیزہ تھی۔ لوگ بڑے شوق سے اس کے پاس جاتے تھے۔ لیکن نا امید ہو کر لوٹ آتے تھے۔ وہ ہمیشہ مغموم نظر آتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکتے رہتے۔ وہ کبھی کھل کر بات نہیں کرتی تھی۔ ایک دن سکھیا نے مجھ سے کہا ——— "میں بیوہ ہوں اور ویشیا بنالی گئی ہوں"۔

بھابی

کتابوں کو کرسی پر پٹکتے ہوئے میں نے کہا "بھابی وہ کون تھیں"

"وہ کون"

بھابی ہونٹوں پر بار بار کھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو اپنے ماتھے پر بل ڈال کر چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔

"جان بوجھ کر انجان بنتی ہو بھابی، لہریا نوہی دوپٹے کا اڑتا ہوا قور۔ اس میں کالی ناگن جیسی لمبی لہراتی ہوئی زلفیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اور شلوار کے تکون پہنچوں کے نیچے گوری گوری لال ایڑی سے ذرا ہٹ کر گذرتا ہوا سینڈل کا لال لال فیتہ۔ اندر قدم رکھتے ہی پلک بھر میں سامنے کے کواڑ سے کسی بھاگتے ہوئے کا ...... بس میں یہی دیکھ پایا تھا۔ جیسے بجلی کی ایک جھلک سی"

"کوئی ہو تمہیں اس سے کیا"

"واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ ہمارے گھر میں کوئی آیا کرے اور تم کہتی ہو مجھے اس سے کیا"

بھابی نے مسکرا دیا

"پڑھنے والے لڑکے۔ لڑکیوں کی باتیں نہیں کیا کرتے"

لیکن بھابی کی یہ "نہیں" باپ اور بڑے بھائی کی "نہیں" نہ تھی۔

اس "نہیں" میں نہ واعظانہ انداز تھا اور نہ نصیحت کا کوئی پہلو۔
اس "نہیں" کا مطلب تھا —— اب کام ہے۔ پھر کبھی سب بتا دینگے۔
نئی نویلی بھابی اور کالج کے پڑھنے والے دیور کے پیار میں کچھ ایک انوکھا پن ہوتا ہے۔ دل کی جن چھپی ہوئی دھڑکن یا اپنی پریم کہانی کو میں جھجھک شرم اور مذاق کے ڈر سے اور کسی عزیز رشتہ دار یا ساتھی کے سامنے ظاہر نہیں کر سکتا۔ اسے بھابی سے بڑے مزے سے بے دھڑک کہہ جاتا ہوں۔ اور بھابی اسے سنتی ہیں۔ بڑی ہمدردی سے۔ نہایت دلچسپی کے ساتھ۔

ماں باپ کی بات چھوڑو۔ وہ لوگ ٹھہرے پرانے زمانہ کے۔ اتنے برسوں کے بعد "اپنی بات" انہیں شاید ہی اب تک یاد ہو لیکن بڑا بھائی نہ جانے کیوں ہمیشہ "یہ نہ کرو" "وہ نہ کرو" چلایا کرتا ہے۔ اس نے تو "اپنا زمانہ" نہیں بھولا۔ شاید وہ سمجھتا ہے "محبت" کا اختیار صرف بڑے بھائی کو ہی ہے زندگی کی ان مختصر اور سہانی گھڑیوں کا مزہ صرف اسی کے لئے نہیں ہے بڑی بہن کہتی، تو کچھ نہیں مگر آنکھیں دکھاتی ہے۔ ایک ہی بھابی۔ وہ بھی نئی۔ تڑپتے دل کو وہ خوب سمجھتی ہے۔ ابھی ابھی تو اس نے محبت بھری دنیا کی سنہری جھلک دیکھی ہے۔

اس دن سے سریتا روز گھر آتی ہے لیکن اب وہ مجھے دیکھ کر بھاگ نہیں جاتی۔ شرماتی ضرور ہے۔ ایک طرف سریتا۔ دوسری طرف میں اور بیچ میں بھابی۔ میں بھابی سے بات کرتا مگر سریتا کے لئے۔ سریتا بھابی سے بات کرتی مگر میرے لئے۔ کھلے منہ بات کرتے پہلے پہل ہم دونوں کو کچھ حیا سی معلوم ہوتی تھی۔ بھابی بیچ میں حائل رہتے ہوئے بھی ہمیں ایسا ڈر لگتا ہے

جیسے ہم لوگ اکیلے میں بات کر رہے ہیں۔ بھابی نے اپنے بڑے پن کو ہماری محبت میں کچھ ایسا کھو دیا کہ ہمیں ان کا بیچ میں حائل ہونا بالکل برا نہ معلوم ہوتا تھا بھابی ہو یا نہ ہو۔ سریتا اور میں ضرور ملتے۔ ہنستے کھیلتے اور باتیں کرتے۔ ادھر ادھر کی ساتھیوں کی۔ کالج کی۔ سینما کی اور کتابوں کی۔ خوابوں کی اور دنیا کی۔ اتنی لمبی جتنی دنیا بغیر کان اٹھائے سن سکے۔ ان باتوں میں نہ جانے کیسی مٹھاس تھی کہ ختم ہونے کو نہ آتیں۔

اور ہمارا پتنگ اڑ چلا —— بادلوں سے کہیں اوپر لیکن اس کی ڈور بھابی کے ہاتھ میں تھی۔ ہمارے اڑنے میں انھیں کوئی آفت نہ تھی۔ مگر وہ ڈر رہی تھیں کہ بہت اونچے میں پتنگ کہیں قابو سے باہر نہ ہو جائے۔

کئی دن بعد اچانک ایک روز بھابی نے مجھے اکیلے میں بلا لیا۔ اُن کے چہرے کی غیر معمولی سنجیدگی کو دیکھ کر میں ڈر گیا۔ جیسے میں نے کوئی بڑا بھاری گناہ کیا ہو۔ بھابی نے کہا ——

"جانتے ہو! کہاں جا رہے ہو"

مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آنکھیں نیچی کرکے پیر کے انگوٹھے سے میں زمین پر نہ جانے کیا کُریدتا رہا۔ گویا بھابی کے سوال کا جواب وہیں —— اسی جگہ زمین کے نیچے گڑھا ہوا ہو۔ مجھے چپ چاپ کھڑا دیکھ کر بھابی نے کہا "محبت کی راہ بڑی ٹیڑھی ہے سرش۔ محبت کرنا آسان ہے لیکن اس کا نباھنا بہت کٹھن۔ جس راہ پر تم چل رہے ہو وہ بڑی سخت اور دشوار گذار ہے۔ سریتا کا ہاتھ پکڑا ہے تم نے کہیں اسے معصوم جان کر راستے میں تو نہ چھوڑ بھاگو گے"۔

ایک دم بے چینی سے بات کاٹ کر میں نے کہہ دیا "مجھے بزدل سمجھتی ہو بھابی!
بھابی نے ترش رو ہو کر کہا "کہنے کو سب ہی آدمی کہہ دیتے ہیں۔ لیکن کوئی ہی اپنی بات پر پورا اترتا ہے۔ آدمی بڑی ڈینگ مارتا ہے مگر آخر کار دھوکہ دے کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔"

"پہلے سے ہی میں تمہیں کیسے یقین دلا دوں بھابی"

"یقین دلانے کی بات نہیں سرش! اپنے دل کو خود ہی ٹٹول کر دیکھو۔ کہیں تم اپنے آپ کو اور بھولی سریتا کو دھوکہ تو نہیں دے رہے ہو۔ ماں باپ کو ناراض کر کے۔ سماج کو ٹھکرا کر۔ ذات برادری سے باہر رہ کر تم اس سے بیاہ کر بھی سکو گے۔ سریتا میں بھی سماج کو چھوڑ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی ہمت ہو سکے گی۔ ماں باپ تمہیں نالائق کہیں گے۔ سماج سریتا کو بے حیا کہے گی۔ ماں تک تم سے منہ موڑ لے گی۔ تم دونوں اپنے آپ کو دنیا سے بالکل الگ پاؤ گے تنہائی ——— مفلسی ——— گھر نہ دار ——— سمجھتے ہو"

بڑی سخت گھڑی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ سماج ——— ماں ——— باپ ——— بیاہ

بھابی نے یہ سوال کیا کر ڈالا۔ سریتا کی محبت میں۔ میں اپنے آپ کو اتنا بھول گیا تھا کہ "کل" کی میں نے کبھی فکر ہی نہ کی۔

"بھابی یہ بیاہ دیاہ اور ذات پات کا بکھیڑا تم نے کیا کھڑا کر ڈالا۔ میں تو بیاہ ہی کے خلاف ہوں۔ میں نے کب کہا ہے میں بیاہ کروں گا۔ کیا بیاہ کر کے ہی محبت ہوتی ہے۔ کیا بیاہ کے بغیر محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں بھابی"۔

” دیکھتی ہوں۔ میں ہی غلطی پر تھی۔ سمجھتی تھی کہ تم اپنا بُرا بھلا سوچ سکو گے۔ جانتے ہو سماج اور دھرم کی نظروں میں مرد اور عورت میں بیوی اور خاوند کی محبت کے سوا باقی قسم کی محبت گناہ ہے۔ جس محبت کا انجام شادی پر نہ ہو اسے دنیا کی کوئی بھی آسان سماج پسند نہیں کرتی“۔

” سماج واج کی بات چھوڑو بھابی۔ تم تو پرانے زمانے کی باتیں کرنے لگیں۔ بیاہ بھی بھلا کوئی ایسی ضروری چیز ہے کہ جس کے بغیر آدمی کی گذر بسر نہ ہو سکتی ہو۔ آدمی کو چھوڑ کر دنیا میں اور بھی کہیں بیاہ ہوتے دیکھا ہے۔ جیسے سربتا اور میں اب محبت کرتے ہیں ویسے ہی ہمیشہ محبت کرتے چلے جائیں گے۔ آرام سے بیٹھیں گے۔ ہنسیں گے کھیلیں گے۔ بس یوں ہی ہنسی خوشی سے دن کٹ جائے گی“۔

” پھر کتابوں جیسی بات کرنے لگے سریش! میں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ یہ ناول اور سینما تمہیں اس دنیا کا نہ رکھیں گے۔ اتنے بڑے ہو گئے مگر یہ ہوائیں اڑانا نہ جانے کب چھوڑ کے گا لیں گے۔! بیٹھیں گے!! ہنسیں گے!!! کھیلیں گے!!!! کیا اس سے سب کچھ ہو جائے گا۔ بھابی کو سبق پڑھا رہے ہو سریش۔ جان بوجھ کر بھی جاننا نہیں چاہتے کہ ان ساری باتوں کا انجام کیا ہو گا —— اور —— بدنامی!! انسان ہو کر حیوانوں جیسے کام کرنا چاہتے ہو تم۔ صرف ایک اس نشے میں اپنے آرام کے لئے فطرت کی آڑھ کیوں لینا چاہتے ہو۔ آج کل کے نئی روشنی کے لوگ چاہتے ہیں۔ اختیار ہو لیکن جبر نہ ہو۔ عیش اور مزہ ہو مگر ذمہ داری نہ ہو۔ جس بیاہ کو تم تن کا ملاپ سمجھتے ہو وہی سماج کو خوش کرنے کی ایک آسان ترکیب ہے۔ جدی کو نیکی

عقل اور تجربہ کا نچوڑ ہے۔ دو چار۔ دو چار پنچوں نے بیٹھ کر بیاہ کی رسم کو ایک ہی دن میں گھڑ نہ لیا تھا۔ سمجھتے ہو"۔

بھابی نے کچھ رک کر پھر کہنا شروع کیا ——

"جب تم بن بیاہی سریتا سے ہی ملنا اٹھنا بیٹھنا اور ہنسنا کھیلنا چاہتے ہو تو پھر بزدلوں اور چوروں کی طرح چھپ کر ایسا کیوں کرتے ہو۔ کیوں نہیں اس ناتے کو انسانوں کی گواہی سے سماج کے ذریعہ پاک اور مضبوط بنا لیتے"

"انسانوں کی گواہی سے! سماج جو برا مانے گی بھابی!! اور آگ کی گواہی سے باپ ناراض نہ ہو جائے گا"۔ میں نے ہمت سے کام لے کر جواب دیا۔

بھابی کا چہرہ انتہائی غصہ سے تمتما اٹھا۔ ان کی تہہ آلود آنکھوں کے سامنے ہیں زمین میں دھنسا جا رہا تھا۔ بھابی نے گرجدار آواز میں کہا ——

"تب تمہیں سریتا کی زندگی سے کھیلنے کا کوئی اختیار نہیں۔ تمہیں اس کی پاک زندگی کو اس طرح برباد کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں آج سے سریتا کو تم سے ہرگز ہرگز ملنے نہ دوں گی۔ تم دونوں کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاؤں گی"۔

"لیکن میں سریتا کے بغیر کیسے رہ سکوں گا بھابی"۔ میں نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ "تب تمہیں جلدی ہی انتخاب کرنا ہوگا۔ سریتا اور سماج میں سریتا اور ماں باپ میں تمہیں ایک دم سے فیصلہ کرنا ہوگا۔ جائز اور ناجائز میں۔ محبت اور فرض میں"۔

میرا سر چکرا رہا تھا۔ مضمحل سا ہو کر میں بیٹھ گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے

خیالات تصویریں بن کر ناچنے لگے — ماں باپ کی ناراضگی - دربدر کی ٹھوکریں سریتا اور میں - سماج کی اٹھتی ہوئی انگلیاں - طعنے طشنے اور مذاق یا پھر — ماں باپ کی خوشی - لیکن سریتا کے بغیر پھیکی زندگی کی تلخ گھڑیاں ایک ناقابل برداشت - اذیت اور جانے کیا کیا ۔

"بھابی! آج کل تم اتنی اُداس سی کیوں رہا کرتی ہو؟"

بھابی نے بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے کہا" سریتا اور تمہارے لئے سرشش"

"نہ بھابی - تم ہم سے کچھ چھپاتی ہو تمہیں کوئی نہ کوئی تکلیف ضرور ہے"

"یہ تمہیں کس نے کہا - مجھے تو ایسا کوئی دکھ نہیں!! بھابی نے بے چین ہو کر کہا"

"تمہیں کوئی دکھ ضرور ہے جسے میں بھی دیکھ رہا ہوں — اور.........!!

"اور کیا"

"اور بھائی صاحب بھی کہہ رہے تھے - تمہاری بھابی کو نہ جانے کیا تکلیف ہے بڑی اُداس رہتی ہے - نہ معلوم مجھ سے کیا ناراضگی ہے - کہتے تھے - مجھے تو اپنا دکھ نہیں بتاتیں شاید تمہیں ہی بتا دے"۔

بھابی سامنے دیوار پر نہ جانے ٹک ٹک کیا دیکھ رہی تھیں - اس طرح بے چین ہو کر بولیں "نہ — نہ سرشیا! مجھے تو کسی بات کی تکلیف نہیں - کئی دن سے ذرا کچھ طبیعت خراب تھی - تمہیں میرے سر کی قسم - اپنے بھائی کو یقین دلا کر کہنا میں بہت خوش - ان دیوتا جیسے شوہر سے اگر میں ناراض ہو کر رہوں تو مجھے دہکتے ہوئے جہنم کی آگ میں جھلسنا پڑے گا - میں انتہائی کوشش کرتی ہوں لیکن ان کو خوش نہیں کر سکتی - نہ جانے کیوں —

وہ بہرے دیوتا ہیں"۔ بھابی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

میں نے سریتا کو ایک بازو بلا کر دبی زبان میں کہا "بھابی کے نام کی چٹھی آئی ہے" "کہاں سے آئی" سریتا نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بمبئی سے"

"کب؟"

"آج ہی ڈاک سے"

"کیا لکھا ہے؟"

"لو پڑھ لو"

"...............ہیں!! یہ کیا؟"

"ہاں! یہی بات ہے"

"لیکن تم نے یہ لفافہ کیوں کھول لیا؟"

"بھابی کے بھائی کی چٹھی سمجھ کر"

"پہلے بھی کھول لیا کرتے تھے؟"

"نہیں"

"پھر؟"

"بھابی کو ستانے کا خیال تھا"

"بھابی ناراض ہو گی؟"

"اسے پتہ لگے۔ تب نا"

"اسے چٹھی نہیں دو گے؟"

"یہی سوچ رہا ہوں"

"کسی بہانے سے دے دو؟"

"بھابی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اور بھائی صاحب۔ ان کا تو دل چور چور ہو جائے گا وہ بھابی سے ۔۔۔ محبت کرتے ہیں"۔

"اور بھابی؟"

"وہ بھی بھائی صاحب کو دیوتا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی ہیں۔ ان سے محبت کرتی ہیں۔ مگر اپنا سب سے بڑا فرض سمجھ کر ۔۔۔ وہ ان کی بیوی جو ہیں"۔

"بس فرض سمجھ کر ہی۔ دل سے نہیں؟"

"دل سے کرنا چاہتی ہیں۔ کرنے کی بہت کوشش کرتی ہیں"

"مگر یہ تو گناہ ہے"

"اتنا ہی جتنا ہم دونوں کا میل میلاپ"

مرینا کا چہرہ شرم سے لال ہو گیا۔

"مگر دونوں نے آپس میں شادی کیوں نہ کر لی؟"

"ماں باپ نے نہ ہونے دی"

"اس میں ماں باپ کا کیا دخل؟"

"ان کی ناک جو کٹ جاتی"

"تب تو بھابی اپنے من موہن کی طرح ساری عمر کنواری ہی رہتیں تو اس سے اچھا تھا؟"

"لڑکی کی مرضی کو کون پوچھتا ہے"

سریتا کچھ دیر کے لئے نہ جانے کیا سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا ان کا موہن فوج میں بھرتی ہونا کیوں چاہتا ہے؟"

"وہ اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا ہے۔ اب مرنا چاہتا ہے"

"لڑائی میں جا کر؟"

"ہاں! خودکشی کو بزدلی سمجھتا ہے"

"اور لڑائی سے بچ کر جو آجائے تو؟"

"بالکل ناممکن"

"اس نے یہ چٹھی کیوں لکھ ڈالی؟"

"اپنی زندگی بھینٹ چڑھانے سے پہلے اپنی محبوبہ کو آخری سلام کہنے کے لئے"

"بے چاری بھابی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا؟"

"تب ہی تو سوچتا ہوں کہ بھابی سے اس کا ذکر ہی نہ کروں"

"یہ ٹھیک ہے؟"

"وعدہ کرو کہ اس چٹھی کا کبھی بھول کر بھی ان سے ذکر نہ کرو گی"

"وعدہ کرتی ہوں"

اسی روز رات کو ــــ

اِدھر میں، اُدھر سریتا اور بیچ میں بھابی۔ بھابی نے ہم دونوں کو دیکھ کر کہا "کیا بات ہے سریش؟"

میں نے کہا "تم سے کچھ کہنا ہے بھابی"

"کیا؟"

"سریتا سے پوچھو"

آنکھیں نیچی کر کے سریتا نے اپنے دوپٹے کے کونے کو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے مروڑتے ہوئے کہا "ان ہی سے پوچھیئے"

"کوئی کہے گا بھی یا یوں ہی؟"

"اس دن کی بات یاد ہے بھابی" میں نے کہا

"کیا؟"

"تم نے کہا تھا تمہیں جلد ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ ایک دم سے چن لینا ہوگا۔ سریتا اور سماج میں ——— سریتا اور ماں باپ میں ———" میں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

"بھابی"

"میں نے آج فیصلہ کر لیا ہے۔ بس چن لیا ہے"

"کسے؟"

"سریتا کو"

"مجھے یقین نہیں ہوتا سرلیش"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں بھابی"

"اور ——— سریتا تم"

"میں ——— میں بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں" سریتا نے یقیں دلاتے ہوئے کہا "سریتا ——— سرلیش ——— پھر تیسری دفعہ چاند کو بیچ میں رکھ کر قسم کھاؤ۔ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت ایک دوسرے سے کبھی الگ نہ کر سکے گی۔

ہم نے چاند کو بیچ میں رکھ کر بھابی کے سامنے قسم کھالی۔

"سریتا لاؤ اپنا داہنا ہاتھ۔ سرشن تم بھی اپنا داہنا ہاتھ دو"

بھابی نے ہم دونوں کے ہاتھ ملا دیئے۔ سریتا اور میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن بھابی دور افق پر نہ جانے غور سے کیا دیکھ رہی تھیں۔ اُنکی جذبات سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے سامنے ماضی کی ایک ایک رسیلی یاد فلم کیطرح آتی اور جاتی۔ بے چاری بھابی کو کیا معلوم کہ اس کے اندر بڑے پیار اور جتن سے چھپائی ہوئی اس کی محبت کا بھید کوئی اور بھی جانتا ہے۔ بھابی کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

دوسرے کمرے سے بھائی صاحب نے آواز دی ' پر بھا۔ کیا کر رہی ہو۔ دیر ہو رہی ہے۔ سینما نہ چلو گی"

بھابی نے جھٹ پٹ اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور بناوٹی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"جی ابھی آتی ہوں"

لیکن میں دیکھ رہا تھا۔ بھابی کے معصوم دل میں محبت اور فرض کی ایک خوفناک جنگ ہو رہی تھی ✣

چھاپا

"بولو - چلتے ہو اوپر" بے چین سا ہو کر آدتیا نے کہا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں، آئے ہی اسی لئے ہیں" مدہوشی کی حالت میں اننت نے جواب دیا۔
"تو پھر چلو - بڑھو نا"
"ابے ٹھہر تو ذرا - جیب تو دیکھ لینے دے"
"ابھی جیب دیکھنا باقی ہی ہے - گھر سے تیار ہو کر نہیں ....؟"
"نہیں نہیں - ایسی بات نہیں ہے - لیکن پھر بھی .... اطمینان"
آدتیا نے اننت کو چکراتے ہوئے زمین پر گرنے سے روک لیا۔
"اونہہ! مجھے ... وہ ــــ ک ــــ کہ ــــ نہ ــــ دے بے"۔
سڑک پر سے گذرتے ہوئے لوگ آدتیا اور اننت کے گرد کھڑے ہو گئے۔ دیکھنے لگے - دونوں دیوانے آپس میں جھگڑ رہے ہیں - ایک نے ذرا زیادہ ہی پی ہے لیکن ....
آدتیا بولا "دیکھ رے اننت آج اس کوٹھے پر چلیں گے - پاس ہی سے گلی جاتی ہے اندھیرا بھی ہے - اور بالکل پری ...."
اننت کو کچھ ہوش آ رہا تھا۔
آدتیا نے کہا "بس اب دیر نہ کر"

"دونوں ایک ہی کوٹھے پر نہ جائیں گے۔ میں ادھر اس کوٹھے پر جاؤں گا"
انگلی سے بتاتے ہوئے اننت بولا۔
"اچھا ایسا ہی سہی"
اور دونوں اپنی اپنی راہ پر لگ گئے۔

ایک — دو — تین

اننت کی زندگی میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا جب وہ رات کے وقت اسطرح ..... بمشکل سیڑھیوں پر سے گذر کر ایک نئی دنیا میں پہونچ گیا۔
دیکھا۔ کمرے میں سفید دودھ جیسی سفید روشنی ہے۔ خوشبو کی مہک سے اس کا دماغ معطر ہوا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کا دل اچھلنے لگا۔
پوڈر سے اس نے اپنے چہرہ کو حسین بنا لیا تھا اور شاید لپ اسٹک بھی .... اور
اننت ابھی ہلکے نشہ میں تھا وہ ہر چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
ایک طرف صوفے رکھے ہیں۔ دوسری طرف ایک خوش وضع پاندان ہے۔ کمرے کے فرش پر ایک جاذب نظر کارپیٹ (CARPET) بچھی ہوئی ہے آرہی اور کارچوب کے کام کے پردوں سے کمرے کو خوب صورت بنا دیا گیا ہے
مس چھایا —— "آیئے ادھر تشریف لایئے"
اننت اس کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"حضور پان کا شوق کریں" چاندی کا پاندان آگے بڑھا دیا۔
"شکریہ" —— پان لیتے ہوئے اننت بولا۔
"واہ میں تو حضور ہی کا دیا کھاتی ہوں حضور ہی کی پناہ ہیں......"

نازو انداز اور لوچ کے ساتھ چھایا بولی۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں"۔ اننت —— کچھ پریشان سا ہو کر بولا۔

"حضور کی خدمت کی جائے گی۔ تشریف تو رکھیئے"

اننت مسکرا دیا۔

اور چلتے وقت —— "تمہیں کیا نہیں مل سکتا۔ دنیا کی کونسی چیز تمہارے لئے مشکل ہے۔ بولو! تمہیں میں نا امید نہیں کرنا چاہتا۔ چاہے جس طرح بھی ہو میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔۔۔۔۔۔"

"مکان کا کرایہ دینا ہے۔ دو سو چاہیئے۔ ایک نیکلیس بنارسی ساڑی ایرنگ ڈائمنڈ کٹ کی ایک انگوٹھی۔

اور اننت ہنس کر "بس"

"حضور کی عنایت چاہیئے"

ایک ہفتہ بعد ——

بینک سے روپیہ نکال کر اننت نے سامان خرید لیا۔ آج وہ چھایا کے کوٹھے پر پھر آیا ہے۔

"یہ لو روپیے نیکلیس بمبئی سے منگوانا پڑا۔ یہاں پر کوئی اچھا مل ہی نہیں سکا۔ یہ دیکھو۔ ساڑی کتنی لاجواب ہے۔ انگوٹھی پھر آجائے گی۔ ایرنگ یہ رہے۔ چھایا نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ان چیزوں کو قبول کر لیا اننت نے دیکھا —— وہ خوش ہونے کے بجائے غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور اداس ہوتی جا رہی تھی جسم کپکپا رہا ہے۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ہے اور ایک جاتا ہے۔ غصہ سے چہرہ تمتما اٹھا ہے۔ ہونٹ کانپ رہے ہیں۔

اننت نے پاگل کی طرح یہ سب کچھ دیکھا۔

چھایا تیزی کے ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بپھری ہوئی ناگن کی طرح لہرا کر بولی

—— "ظالم کہیں کا! تو نے بیوی کو پیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ اس کے کھانا اور کپڑا مانگنے پر تو نے آنکھیں نکالی۔ بید کی مار کی بوچھار کی تو نے اسے لونڈی سمجھ رکھا تھا۔ تو نے اسے چین سے گھر کے ایک کونے میں رہنے نہ دیا۔ دن رات اُسے تو نے جلایا۔ پیٹا اذیت پہونچائی۔ تو نے اسے منحوس کہا جہنم میں ڈھکیل دیا۔ خون کیا —— نیچ۔ کمینے"

"ارے! کون —— تم پاروتی" —— اننت چکرا کر زمین پر گر پڑا اس وقت کی پاروتی اور آج کی چھایا اننت کے ماتھے پر برف کی تھیلی رکھے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ::

پگڈنڈی

اس وقت میں ایسی نہیں تھی۔ لوگ سمجھتے ہیں میں ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں۔ موٹی۔ چوڑی، بھاری بھرکم۔ زمانہ کے مصائب کا مقابلہ کرتی اور اسی طرح ڈھلتی دنیا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک لیٹی ہوئی۔ وہ بات تو پرانی ہے۔ کوئی کیا جانے۔ اس وقت میں نہ تو اتنی لمبی تھی نہ اتنی چوڑی۔ نہ چہرے پر اینٹوں کی سی سُرخی تھی نہ بدن پر کنکروں کے گہنے۔ میرے دائیں بائیں درختوں کی جو یہ قطار آپ دیکھ رہے ہو وہ بھی نہیں تھیں نہ فٹ پاتھ تھا نہ بجلی کے کھمبے۔ پریوں کی سی سجی نہ یہ دوکانیں تھیں نہ انگوٹھی کے نگینے کی طرح یہ پارک۔ میں تو تب ایک چھوٹی سی پگڈنڈی تھی۔ دبلی ــــ پتلی۔ نازک۔ نٹ کھٹ۔

میں کب سے ہوں۔ اس کی بھی تو یاد نہیں آتی۔ مگر ایسا گمان ہو رہا ہے کہ امرائی کے اس پار کی کوئی دوشیزہ ندی سے پانی لانے کیلئے اس پار گئی ہوگی۔ جیسے کسی سانحہ کے بعد کسی بڑے واقعہ کا جنم ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد پھر ایک دھرم بھی نکل پڑتا ہے اسی طرح اس دوشیزہ کے پانی بھر لانیکے بعد گاوں کی ساری سندریاں، دوشیزائیں گھڑے میں پانی لے کر اٹکتی اٹھلاتی ایک ہی راستہ سے آتی رہی ہوں گی۔ اور پھر اس سے میری زندگی کی کہانی بہ نکلی۔

میرے آسمان ماضی کے دو تارے اب بھی میری زندگی کے سونے پن کی

تاریکی میں جھلملا رہے ہیں۔ یوں تو ساری امرائی سارا گاؤں میرے ملاقاتیوں سے بھرا تھا۔ مگر میری صرف دو حضرات سے گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک تھا بڑ دادا۔ دوسرا تھا رامی کا کنواں۔

بڑ دادا امرائی کے سب ہی درختوں میں بوڑھے تھے اور سب ہی اُنھیں عقیدت و بزرگی سے بڑ دادا کہا کرتے تھے۔ وہ تھے تو درخت لیکن ان کا دل بچوں سے بھی زیادہ صاف اور نوجوانوں سے بھی زیادہ جذبات سے بھرا تھا۔ وہ امرائی کے بزرگ خاندان تھے۔ ان میں ریاضت کرنے والوں کا تیج بھی تھا۔ اور گرہستی کرنے والوں کی سی ملائمت بھی۔ ان کی ٹھنڈی چھاؤں پر لیٹ کر زمانہ کی حسرت و یاس سے بھری کہانیاں سننا۔ رم جھم۔ رم جھم بارش میں ان کی ٹہنیوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے پرندوں کا برسات کا مزا لوٹنا۔ آج بھی یاد کر کے میں رونے لگتی ہوں۔

ٹھیک انہیں سے پرے رامی کا کنواں تھا۔ پکا ٹھوس۔ صاف ستھرا صبح سویرے گاؤں کی عورتیں چھن چھن کرتی آتیں۔ اور امرائی کو اپنی سریلی آوازوں سے گونجا کر کنوئیں سے پانی بھر کر مجھے بھگوتی روندتی ہوئی چلی جاتیں۔

میری چڑھتی ہوئی جوانی کا آغاز — انھیں سے ہوتا ہے۔ آغاز بھی انھیں سے خاتمہ بھی انھیں سے۔ بھولنے کی کوشش کرنے کے باوجود بھی کیا میں بھول سکتی ہوں؟

انسان کی زندگی کی تاریخ اپنے عزیز و اقارب سے نہیں پرایوں سے بنی ہے ایسا کیوں ہوتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر اکثر دیکھا جاتا ہے کہ

کبھی کی سنی ہوئی بولی - کبھی کا دیکھا بھالا چہرہ - گھڑی دو گھڑی کی ملاقات زندگی کی تاریخ کا ایک واقعہ، یاد کی ایک قیمتی شئے بن کر رہ جاتے ہیں - اور اپنے عزیزو اقارب کا قریبی سماج اپنی زندگی کا سارا ماحول کنول کے پتوں کے چاروں طرف کے پانی کی طرح چھل چھل کرتا رہ جاتا ہے وچھل اچھل کرتا ہے - بہہ جاتا ہے - ٹک نہیں سکتا - میں سوچتی ہوں ایسا کیوں ہوتا ہے؛ لیکن سمجھ نہیں سکتی۔

جیٹھ کے دن تھے - کھڑی دوپہر — گرم ہوا - امرائی کے درختوں میں لڑھکتی پھرتی تھی - بڑ دادا اونگھ رہے تھے - ایک درخت سے لپٹی ہوئی دو بیلوں میں جھگڑا ہو رہا تھا - میں ان کی لڑائی دیکھ سن رہی تھی۔

اتنے میں کنوئیں نے کہا — "پگڈنڈی — سو گئی کیا؟"

"نہیں تو" میں نے کہا "ان بیلوں کا جھگڑا سن رہی ہوں"۔

کنوئیں نے ہنس کر پوچھا — "بات کیا ہے"؟

میں نے کہا "کچھ نہیں - ناحق کا جھگڑا ہے - دونوں بے وقوف ہیں"۔

کنوئیں نے ہنس کر کہا "دنیا میں کوئی بے وقوف نہیں — حالات سب کو بے وقوف بنا دیتے ہیں - اس امرائی میں تم اکیلی ہو - کل ایک اور پگڈنڈی بن جائے تو پھر کیا اس کا امکان نہیں کہ تم دونوں لڑنے جھگڑنے لگ جاؤ"۔

میں کھیج کر بولی "معمولی بات میں بھی میرا ذکر کھینچ لانے کا تمہیں کیا اختیار ہے"؟

کنوئیں نے پوچھا "انھیں بے وقوف کہنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

میں نے کہا "میں سو بار کہوں گی — ہزار بار کہوں گی - وہ دونوں

بے وقوف ہیں۔ تم بھی احمق ہو۔ سب بے وقوف ہیں" اتنے میں بڑے لالا بھی جاگ پڑے۔ بولے "کس کو احمق کہہ رہی ہو؟"

بات رک گئی۔ کنواں چپ ہوگیا۔ دو دن تک بول چال بند رہی۔ میں جان بوجھ کر اس سے کیوں لڑی۔ اس کو وہ کہاں سمجھ سکا۔ مجھے اس پر غصہ بھی آیا اور نفرت بھی۔ عورت محبت سے بیخود ہو جاتی ہے اور جب وہ اپنے دلی جذبات و احساسات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ تب جھگڑا کرتی ہے۔ عورت کا سب سے بڑا ہتھیار ہے رونا۔ اس کا سب سے بڑا بل ہے جھگڑا کرنا۔ جھگڑا کرکے سسکنا۔ روٹھ کر رونا۔ پھر دوسرے کو رلا کر مان جانا نسوانی دل کا چھپتا موضوع ہے۔ مرد خواہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو، ادیب ہو، عاشق مزاج ہو، فلسفی ہو اگر وہ اتنی سیدھی بات نہیں سمجھ سکتا تو بے وقوف ہے۔

یہ واقعہ کچھ نیا نہیں تھا۔ ہمیشہ کا تھا۔ کوئی چھوٹی سی بات لے کر ہم لڑ پڑتے۔ آپس میں کچھ کہہ سن لیتے۔ پھر ہفتوں ایک دوسرے سے نہیں بولتے۔ مگر یہ بات جس کے لئے میں سب کچھ کرتی سارا جھگڑا کھڑا کرتی کبھی نہیں ہوتی۔ کنواں مجھے کبھی نہیں مناتا تھا۔ آخر میں ہار کر مجھے ہی بولنا پڑتا۔ تب وہ اس طرح بولنے لگتا گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں دل ہی دل میں سوچتی یہ کیسی عجیب و غریب بات ہے کہ نہ تو اسے روٹھنے سے کوئی تکلیف ہوتی ہے اور نہ منانے سے کوئی خوشی۔ خود بھی تو نہیں روٹھتا۔ صرف خاموش ہی رہتا ہے، بولتی ہوں تو پھر بولنے لگتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ـــ اے ایشور! کیا اپنے دلی صدمات کی ساری

ہتھیلی میرے لئے کھول رکھی ہے۔

اس واقعہ کا میں نے کوئی خاص خیال نہیں کیا۔ مگر وہ بات رہ رہ کر میرے کانوں میں گونج اٹھتی۔ اس امرائی میں تم تنہا ہو۔ کل ایک پگ ڈنڈی بن جائے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ پھر تم دونوں لڑتے لگ جاؤ — اس کی تشریح میں نے کیسے کی۔ اس سے لڑائی کی۔ اسے بے وقوف بنایا — کنوال سمجھتا ہے کہ میں عورت ہوں۔ اور عورت کی کمزوری بھی میری کمزوری ہے۔ اس کی وضاحت کرنے کے عوض میں خود اس کی تیلی کو رو کر دیتی ہوں۔ پھر بے وقوف میں ہوئی یا وہ؟

مجھے رہ رہ کر اپنی کمزوری پر غصہ آجاتا ہے۔ اگر اسے میرے لئے کوئی ہمدردی نہیں میرے روٹھنے کی کوئی فکر نہیں مجھے منانے کا اصرار نہیں تو پھر میں کیوں اسکے لئے مرنے لگی۔ اگر وہ سنگدل ہے تو میں بھی سنگدل بن سکتی ہوں۔ اگر اسے خود پر قابو حاصل ہے تو میں بھی اپنے آپ پر قابو پانا سیکھ سکتی ہوں۔ میں نے قسم کھالی کہ اس سے روٹھوں گی ہی نہیں۔ اور اگر روٹھوں گی تو بولوں گی ہی نہیں۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ پریم کے لئے نسوانیت کو نہیں گھٹاؤں گی۔

ایک دن کی بات ہے اسوج کا مہینہ تھا۔ ابھی ابھی برسات گذری تھی نہ کیچڑ تھی نہ دھول۔ چھوٹی ہری گھاس اور جنگلی پھولوں کے بیچ سے میں امرائی کے اس پار سے اس پار تک لیٹی ہوئی تھی۔ اس ہریالی کے بیچ مجھے ایسا معلوم ہوتا گویا کسی دوشیزہ کا بستر ہے۔ شاید وہ میرے روپ رنگ میں بسا ہوا تھا میں کچھ سوچ رہی تھی۔ یکایک کنوئیں نے کہا

"پگڈنڈی سنتی ہو۔"

میں اُمنگی ہو کر بولی "کہو؟"

اس نے کہا "تم دنوں دن موٹی ہوتی جا رہی ہو"

میں کچھ نہیں بولی۔

کچھ ٹھہر کر پھر بولا "پہلے دبلی تھیں تو اچھی معلوم ہوتی تھیں۔"

میں نے کہا — "اگر میں موٹی ہو گئی ہوں تو صرف تمہیں اچھی معلوم ہونے کے لئے تو

یہ تو میں نے کہا نہیں کہ دبلی ہو کر تم مجھے اچھی معلوم ہو گی!

میں نے پوچھا — تب تم نے کہا کیا؟"

اس نے کہا "شاعروں کا کہنا ہے کہ دبلا پن عورت کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ موٹی ہونے سے تم شاعروں کے حسین افکارات سے دور ہٹ جاؤ گی"۔

میں نے کھیج کر پوچھا "تم تو اپنے کو شاعر نہیں سمجھتے ہو نا؟"

اس نے کہا "بالکل نہیں"

میں نے پوچھا "پھر موٹی ہو جانے سے میں شعرا کو بری معلوم ہونگی یا اچھی اس سے

تمہیں کیا مطلب"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "کچھ بھی نہیں۔ صرف اسی لئے کہ میں ان حسین افکارات کو جانتا ہوں۔ اور میں تمہیں بھی تبلا دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں"۔

میں نے متانت سے کہا ”شکریہ“

عورت اگر سچ مچ وہ عورت ہے تو سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔ مگر اپنے حسن کی تحقیر کبھی نہیں سن سکتی۔ عورت خواہ بدصورت ھی ہو مگر مرد کو اُسے بدصورت کہنے کا کوئی حق نہیں۔ عورت کی نسوانیت ہی دنیا کا سب سے بڑا حسن ہے۔ اور اس کے خلاف کہنا اس کے حسن کی تحقیر کرنا ہے۔ عورت کے حسن کو بُرا کہنا ویسا ہی ہے جیسے کسی مرد کو بُزدل کہنا۔ میں سمجھ گئی کہ کنواں مجھ پر — ریجھ کر میرے گُن گا رہا ہے بالراست نہ سہی۔ میں نے دل میں سوچا کہ خواہ کچھ بھی ہو میں آج سے لڑنا شروع کر دوں گی۔

اس دن رات کو چاندنی چھٹکی تھی۔ شفاف چاندنی میں ساری امرائی مست ہو کر جھوم رہی تھی۔ بڑ دادا انکھیوں کو سلا کر آپ بھی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ بولے ”سو گئی بیٹی“

میں نے کہا — ”نہیں دادا۔ ایسی چاندنی کیا ہمیشہ رہتی ہے۔ میرے دل میں تو یہی آتا ہے کہ جیون بھر ایسے ہی لیٹے لیٹے چاند کو دیکھتی رہوں“۔ اتنے میں کنواں بولا — ”دادا۔ امرائی میں بیاہ کے گیت ابھی سے شروع کروا دو“

دادا نے پوچھا — ”کیسا بیاہ؟“

اس نے کہا — ”دیکھتے نہیں پریم کا پہلا دور شروع ہو گیا ہے۔ دوسرے دور میں نظمیں بنیں گی۔ تیسرے دور میں پاگل پن سوار ہوگا۔ چوتھے میں سگائی ہو جائے گی۔“

مجھے دل ہی دل میں گد گدی ہونے لگی۔ سوچا۔آج اسے کھا جاؤں گی۔میں نے ہنس کر کہا" دادا۔دیکھو اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔ایشور نے تمہیں اتنا اونچا بنایا ہے۔تم اپنی بے شمار انگلیوں سے سورج اور چندرماں کی کرنوں کو چھوتے ہو۔اور کسی کنج تنہائی سے آئی ہوئی ہوا میں غسل کر کے فضا میں سر اٹھا کر فطرت کو نہارتے ہو۔ستاروں سے بھری ہوئی رات میں پرندوں کو اپنی گود میں لے کر تم چاند کی دنیا کی کہانی سنایا کرتے ہو۔شفق تمہیں چوما کرتی ہے۔فطرت کا یہ خزانہ تمہارے لئے تو ہے۔میں تمہاری جیسی اونچی تو نہیں ہوں۔پھر بھی دور تک پھیلی ہوئی ہوں۔فطرت اپنی رنگ رلیاں میرے سامنے بکھیر دیتی ہے۔آکاش، سورج اور چندرماں کی کرنوں کا جال مجھ پر پھیلا دیتا ہے۔بسنت کی دل فریبی۔ساون کی ہری بھری ہریالی کا صاف ستھرا حسن میری زندگی میں چہل پیدا کر دیتا ہے۔میں صرف زندہ ہی نہیں زندگی کی لذتوں کا لطف بھی اٹھاتی ہوں۔مگر مجھے دکھ تو ان لوگوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جنہیں نہ تو سورج کی روشنی ملتی ہے نہ چاند کی کرنیں۔تاریکی ہی جن کی زندگی کا جزو لازمی ہے۔اور سونا پن ہی جن کی ایک کہانی ہے۔وہ آسمان کو اتنا ہی بڑا سمجھتے ہیں جتنا ان کے باطن میں سما سکتا ہے۔فطرت کو اتنی ہی دور تک سمجھتے ہیں جتنی وہ دیکھ سکتے ہیں۔دادا۔تم نے کبھی سوچا کہ وہ کیسے بد قسمت ہیں؟"

دادا کچھ نہیں بولے۔شاید سو گئے تھے۔لیکن کنواں بولا۔

—" سن رہے ہو بڑے دادا - پگڈنڈی کتنا سچ کہہ رہی ہے - ایسے لوگوں سے زیادہ خراب زندگی اور کسی کی ہوگی - کچھ دن پہلے میں بھی سوچا کرتا تھا - مگر مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں اور بھی لوگ ہیں جن کی زندگی ان سے بھی خراب ہے - ایشور نے جسے سورج اور چاند کی روشنی سے محروم رکھا جسے آسمان و فضا کے حسن کو دیکھنا نصیب نہ ہوا اس پر رحم کھا کر اس کو ایک ایسی چیز دے دی ہے جس سے وہ اس کا احسان مان سکتا ہے جسے وہ اپنا کہہ سکتا ہے - جس کے ذریعہ وہ دنیا کا کسی نہ کسی روپ میں نشان بن سکتا ہے - مگر اس سے زیادہ بدقسمت تو وہ ہیں جن کے سامنے دنیا کا سارا حسن بکھرا پڑا ہے مگر ان کے پاس اپنا کہنے کو کچھ بھی نہیں - لکیریں شمار کرنے والوں کی لکیر کی طرح ان کا وجود تو ہے مگر ان کی موٹائی - لمبائی چوڑائی سب کچھ تخیلی ہے - ان کا وجود کسی دوسرے کے وجود پر منحصر ہے وہ سب کے آثار ہیں لیکن ان کا عکس کسی میں نہیں ایسے لوگ بھی دنیا میں ہیں دادا - کیوں اس پر تمہیں ترس نہیں آتا؟

دادا بالکل سو گئے تھے - میں نے طیش میں آکر کہا " راہی کے کنوئیں! اگر تم سمجھتے ہو کہ تم دنیا کی بھلائی ہو اور میں صرف واسطہ —— تو یہ تمہاری بھول ہے - دنیا میں جو کچھ ہے حقیقت ہے تخیل کچھ بھی نہیں - تخیل انسان کی الجھی ہوئی فکر کا پھل ہے - جب وہ ایک جذبہ کے تحت آجائے - قائم اور مادی روپ میں جو وجود میں آئے وہی عکس یا واسطہ ہے - خواہ کسی روپ میں ہو "

کنوئیں نے سنجیدگی سے کہا " تم نے میرا پورا نام لے کر پکارا جس کیلئے

"میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ میں جواب میں صرف دو باتیں کہوں گا۔ پہلی تو یہ کہ تمہارا ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں شخصی لحاظ سے نہ تم نے مجھ سے کہا اور نہ میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو تم کہہ رہی ہو حقیقت اور تخیل اس میں کسی قسم کا فرق نہ ہوتے ہوئے بھی نتیجتاً کچھ فرق ہے۔ دنیا میں فکر و تخیل کے نام کی کوئی شئی نہیں ٹھیک ہے۔ جہاں جو کچھ ہے کسی نہ کسی روپ میں موجود ہے یہ بھی ٹھیک ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ موجودات میں بھی بعض ایسی چیزیں ہیں جنہیں موجود تو نہیں کہا جا سکتا اور کچھ ایسی حالت میں ہیں جنھیں دنیا غرض کے تحت تخیل یا فکر ہی کا نام دینا پسند کرتی ہے اس کا واضح و نمایاں اثر یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس سنسار آتا ہے ہاتھ پھیلا کر کچھ مانگتا ہے اور پھر چلا جاتا ہے۔ دنیا کی روزمرہ اور کاروباری زبان میں تو وہ ہوا تخیل یا فکر۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے ہاں سنسار آتا ہے مگر اس لئے نہیں کہ وہ ان سے کچھ لینا چاہتا ہے بلکہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ وہ اپنے تخیل کو پہونچ سکتا ہے۔ تمہاری زبان میں ایسے لوگ ہوئے تخیلی ——— سمجھیں؟"

میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ اس نے روک دیا۔ کہا ——"دیکھو تمہاری چاندنی ڈوب گئی اب تو سو سکتی ہو یا نہیں؟

کچھ دن اور گذر گئے ——میرے پریم کی آگ پر فخر کی راکھ پڑنے لگی۔ کنواں دنیا کی یادگار ہے میں صرف ایک واسطہ ہوں۔ پھر میرا اس کا پریم کیسے ہو سکتا ہے؟ میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ محبت میں

کشمکش کیسی؟ ہاں تو اس دنیا میں سب کچھ ہے اور میں کچھ بھی نہیں - پھر بھی کیا اس سبب سے اگر میں اس سے پریم کروں تو وہ اس کا جواب نہ دے؟ کنواں اپنی دنیاوی اہمیت کے فخر میں چور ہے - وہ سمجھتا ہے کہ اس کے سامنے میں اتنی حقیر ہوں کہ مجھ سے محبت کرنا تو دور رہا منہ بھر بولنا بھی گناہ ہے وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے - میری تذلیل کرتا ہے - بات بات میں مجھے نیچا دکھانا چاہتا ہے - مرد کی ذات ہی سنگدل ہوا کرتی ہے -

میں روز بروز اس سے دور ہٹنے کی کوشش کرنے لگی - اس کی قربت سے میرا دم گھٹنے لگا - وہ بڑا سخی ہے - دنیا اس کے سامنے بھکاری بن کر آتی ہے - اور میں ---- میری تو کوئی اہمیت ہی نہیں - کسی مقصد تک پہونچنے کا ایک ذریعہ یا واسطہ ہوں - میرا اور اس کا کیا مقابلہ ---

شام سویرے گاؤں کی لڑکیاں آتیں اور پانی بھر لے جاتیں - کھڑی دوپہر مسافر امرائی میں آرام کرنے کے لئے آتے اور کنویں کے پانی میں ستو سان کر کھاتے - پھر تھوڑی دیر درختوں کے نیچے لیٹ کر اپنی راہ چلے جاتے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے امرائی میں آکر پھل توڑتے اور کنویں سے پانی کھینچتے اور پھر پھل کھا کر ہاتھ منہ دھو کر چلے جاتے - جہاں دیکھو اسی کا ذکر اسی کی بات - میں اپنی کس مپرسی پر دل ہی دل میں کڑھ گھٹ جاتی - مجھے ایسا معلوم ہوتا دنیا میری تذلیل کر رہی ہے - آسمان مجھے حقارت سے دیکھ رہا ہے - زمین میری برائی کر رہی ہے ...... میں سب کی ہوں لیکن میرا کوئی نہیں - میں بھی اپنی نہیں - صرف دنیا کو کسی منزل یا مقام تک پہونچانے کے لئے ایک واسطہ بن کر رہی ہوں - مجھے یہاں سے

ہٹنا ہی پڑے گا۔ خواہ کہیں بھی جاؤں۔ جاؤں گی ضرور سکون قلب کیلئے میں بھٹکوں گی۔ اس کونے سے اس کونے تک تلاش کروں گی اگر کہیں بھی سکون نہیں ملا تو کسی دوسری سرزمین پر میں جاؤں گی۔ یا کسی پہاڑ کے غار کی بے پناہ تاریکی میں جا کر سو رہونگی پھر بھی یہاں نہیں رہوں گی۔ میں وہاں سے ہٹنے کی کوشش کرنے لگی۔

آدھی رات تھی۔ چاندنی اور تاریکی امرائی کے درختوں کے نیچے لیٹے سو رہے تھے۔ مجھے رات کی ساری باتیں اب بھی یاد ہیں۔ گویا ابھی کل ہی کی ہوں۔ میں اپنی پرانی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں مشغول تھی کہ اتنے میں کنوئیں نے پکارا "پگڈنڈی"

فضا کے سونے پن میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ میں چونک پڑی اتنے دنوں کے بعد کنواں مجھے پکار رہا ہے۔ میرا اضطراب بڑھنے ہی لگا میں نے کہا "کیا ہے؟"

کنواں تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر پکارا "پگڈنڈی"

شاید اس نے میرا جواب سنا ہی نہیں۔ مجھے حیرت ہونے لگی۔ کیا سچ کوئی نئی بات ہوگی۔ میں نے استفسارانہ لہجے میں کہا "کیا ہے؟"

کنواں بولا "پگڈنڈی۔ میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں"

میں نے کہا "پوچھو"

وہ بولا "شاید تم یہاں سے کہیں جا رہی ہو"

اس وقت اگر بجلی گر پڑتی تو مجھے اتنی حیرت نہیں ہوتی۔ اسے کیسے معلوم ہوا۔ اگر میں کسی طرح مان بھی لوں تو پھر اسے کیا مطلب میں

لمحہ بھر ہی میں نہ جانے کیا کیا سوچ گئی۔ کتنے ہی جذبات سے میرا دل اتھل پتھل ہو اٹھا۔ مگر میں نے اس تلاطم کو روک کر مایوسانہ لہجہ میں کہا "ہاں"

کنواں تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر بولا "تم اس امرائی سے جا رہی ہو اچھا ہے میں بہت خوش ہوں"۔

میں کچھ جواب دے رہی تھی کہ اس نے روک دیا "ٹھہرو میری بات سن لو۔ جب تم پہلے پہل یہاں آئی تھیں تب جتنا خوش میں ہوا تھا اتنا اور کوئی نہیں۔ آج جب تم یہاں سے جا رہی ہو۔ تب بھی جتنی خوشی مجھے ہو رہی ہے اتنی اور کسی کو بھی نہیں۔ تم اس کا سبب جانتی ہو؟"

میں کچھ نہیں بولی۔

وہ کہنے لگا "میں تمہیں کسی دن کہنے والا ہی تھا۔ تم نے خود جانے کا ارادہ کر لیا۔ یہ اور اچھا ہوا"۔

میں انمنی سی ہو کر بولی "دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اچھا ہی ہوتا ہے"۔

کنواں بولا "پگڈنڈی تم یہاں سے جا رہی ہو۔ قیاس ہے کہ پھر تم یہاں لوٹ کر نہیں آؤ گی۔ تمہارے جانے سے پہلے میں تم سے اپنے دل کا ایک بات ایک راز کی بات کہوں گا۔ سنو گی تو؟"

میرے دل میں اس وقت دو دھارائیں بہہ رہی تھیں۔ ایک اعتماد کی دوسرے شک و شبہ کی۔ پھر بھی اتنا ہوا کہ مجھے شک سے زیادہ اعتماد ہی ہوا۔ میں نے بے چینی کو دبا کر کہا "کہتے جاؤ"۔

کنواں کہنے لگا "مجھے کچھ زیادہ نہیں کہنا ہے۔ صرف دو باتیں ہیں جو

ہیں نے تم سے کبھی نہیں کہی تھیں۔ اس وجہ سے کہ ابھی تک اس کے کہنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ اب تم جا رہی ہو۔ معلوم ہوتا ہے وہ وقت آگیا اسلئے کہہ رہا ہوں۔"

کچھ رُک کر حسب معمول طریقہ سے اس نے کہنا شروع کیا۔

"پہلی بات یہ ہے کہ تم سے اتنی محبت ہونے کے باوجود میں نے اس کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مجھے یاد ہے جس دن آسمان کی معینہ راہو نکی طرح تم پہلے پہل اس امرائی میں آکر بچھ گئی۔ اس دن میں نے بڑو دادا سے پوچھا تھا۔ دادا یہ کون ہے دادا نے مذاق سے کہا تمہاری بیوی ہے میں جھینپ گیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک ایک قرن بیت گیا۔ کتنی بہاریں آئیں کتنی برساتیں آئیں اور اس امرائی کی گھنی چھاؤں میں ہم دونوں نے کئی کہانیاں سنیں۔ کتنے گیت سن کر پھر بھول گئے۔ اور کتنی بار ہم آپس میں لڑے جھگڑے ہیں۔ اس سابقہ زندگی کا چھوٹا سا واقعہ بھی میری یاد کے پردہ پر جاودانی لکیر بن کر کھینچ گیا ہے۔

آڑے ترچھے لکیروں کو جوڑ کر جو حروف بنتے ہیں ان کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ اس امرائی میں چھوٹی پتلی سی جو ایک پگڈنڈی ہے اس پگڈنڈی کے ہونے پن کی زندگی کا جو حاصل ہے وہ کسی زمانہ یا ایک ملک کا نہیں یعنے وہ دنیا بھر کی ملک ہے، یہ دنیا کیلئے سبق بن سکتا ہے۔ وہ نہ رہے لیکن اس کی کہانی زمانہ تک تخیل کے وسیع آسمان میں نسوانیت کا جوھر بن کر آکاش دیپ کیطرح جھلملاتی رہے گی ـــ اتنا ہوتے ہوئے بھی آج تک میں نے تم سے کچھ کیوں نہیں کہا؟

اتنا ہی نہیں۔ میں نے اب تک تمہارے سامنے ظلم و یاس کے جذبات ہی ظاہر کئے۔ ہنسی مذاق وغیرہ مجھے یاد نہیں۔ میں یہی کچھ دے سکا ہوں یا نہیں۔ لیکن کیوں صرف ایک ہی سبب تھا۔ پگڈنڈی کیا میں نہیں جانتا تھا؟ کیا تمہارے دل کو اچھی طرح پہچانتا نہ تھا؟

میں تمہاری زندگی کو بنا رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ دنیا کی بھلائی کی راہ کیلئے تمہارا جنم ہوا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ کس تخیل کو لے کر دنیا کی اپنی تو نے تمہیں جنت سے لاکر اس امرائی کی گھاسوں اور پتوں کی سیج پر سلا دیا ہے میں یہ بھی جانتا تھا کہ تمہاری زندگی کا جو مقصد ہے وہ تم کس راہ پر چل کر زیادہ سے زیادہ پا سکتی ہو۔ جس اعلیٰ وارفع مقصد کو لے کر تم نے جنم لیا ہے اسے میں جانتا ہوں۔ باوجود خواہش و میلان کے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا مگر ہاں۔ ایک بات کر سکتا ہوں۔ گانے والا اپنی تان کو حلق میں نچاتا ہوا سم پر بٹھا دیتا ہے۔ سننے والے اسکی داد نہیں دے سکتے۔ پھر بھی آخر میں سم پر ایک بار سر ہلا دیتے ہیں۔ تان لوٹ کر گھر آگئی۔ سب کا سر ہل گیا پگڈنڈی اپنے زندگی کے بلند مقصد کو تمہیں تنہا ہی نبھانا ہوگا۔ میں صرف اتنا ہی کر سکوں گا کہ جس دن تمہاری زندگی کی تان لوٹ کر گھر آجائے گی اس دن اس سنگیت میں اپنے آپکو بھا دونگا سر ہلا دوں گا۔ تمہارے جیون سنگیت کی تانوں پر اپنے کو نچھاور کر دوں گا!

محبت سے جنت ملتی ہے۔ لیکن اس سے بھی اونچا اس سے بھی مقدس ایک مقام ہے۔ اس کی راہ وہی ہے جس پر تم جا رہی ہو۔

خدمت، محبت سب ہی کر سکتے ہیں۔ مگر خدمت سب سے نہیں ہو سکتی
محبت دنیا کا معمول ہے۔ مگر خدمت ایک ریاضت ہے۔ محبت دل کے
سارے لطیف جذبات کا مخزن ہے۔ خدمت اس کا ایک جزو۔
محبت سے خود متاثر ہو کر اپنی ایک کوئی یادگار بنانی پڑتی ہے۔
خدمت سے اپنے کو دنیا کا خدمت گار بنا کر دنیا کو اپنی ریاضت و
ایثار کا گھر بنانا پڑتا ہے۔ محبت عبادت ہے۔ اور خدمت ریاضت۔ محبت سے
معشوق ملتا ہے۔ اور خدمت سے ایشور۔

پیدائش سے لے کر آج تک تم خدمت کی راہ پر ہی رہیں اور اب
بھی اسی پر آگے بڑھی جا رہی ہو — تمہاری راہ میں جو سب سے بڑی
دیوار حائل ہو سکتی ہے وہ پریم کی ہے محبت انسانیت ہے اور خدمت
فرشتہ پن۔ تمہاری روح پاکیزہ ہوتے ہوئے بھی تمہارا جسم
مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ روح اور بدن کا یہ ملاپ —
دنیا کی امر کہانی ہے۔ بسنت جب اپنی بہار زمین پر اونڈیل دیتا ہے،
برسات جب — ہریالی بکھیر دیتی ہے بادل کے سفید لکے جب آسمان
پر تیرنے لگتے ہیں تب روح کی گہرائیوں میں جسم چھوٹے چھوٹے سپنے
چھوڑ دیتا ہے۔ سام وید کے مدھر اور متین لہجہ میں میگھ ملہار کی
تانیں چھڑنے لگتی ہیں جب آنسو جھڑنے لگتے ہیں تو کیلاش میں بسنت
آجاتا ہے۔ بہت پرانا قصہ ہے۔ زمانہ دراز سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اور
یہی ہوتا رہے گا۔ پھر بھی سب ہی اسے بھول جاتے ہیں۔ آنکھیں
موند جاتی ہیں۔ ریاضت کے صاف و شفاف آسمان میں جب نغمہ راگ کی

سرخی پڑتی ہے تو ریاضت کا برف پگھلنے لگتا ہے۔ ملگن کی آگ بھڑکنے لگتی ہے۔ دل کی تنہائیوں میں کسی کی چھایا گھس پڑتی ہے۔ بیداری میں انگڑائی آجاتی ہے خوابوں میں خمارستی آنے لگتی ہے۔او۔۔۔۔۔۔اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تب کہیں کچھ نہیں رہتا — پھر سے نئی کہانی شروع ہوتی ہے۔ نئی یاترا ہوتی ہے۔ نیا معبد ہوتا ہے۔ اس طرح یہ دنیا چلتی ہے۔

جب دنیا میں کسی نہ کسی سے محبت کرنا کسی کی محبت کا کردار بننا ہر شخص کا حق ہے تو پھر میں — صرف میں ہی کیوں اس سے محروم رہوں یہ زندگی کا دائمی تحفہ ہے۔

مگر سچ کیا ہے۔ لوگ یہ سمجھنے کی بہت کم کوشش کرتے ہیں۔ جن کے پیر ہیں وہ زمین پر چلتے ہیں مگر جنھیں پر ملے ہیں وہ زمین ہی پر چلیں تو یہ اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال ہوا جنھیں خدا نے آسمان میں اڑنے کیلئے بنایا ہے ان کے لئے زمین پر چلنا اپنی تحقیر آپ کرنا ہے۔ اپنے کو بھول جانا ہے۔ محبت کرنے کی صلاحیت سب میں ہے مگر خدمت کی طاقت کسی کسی کو ہی ملتی ہے۔ خدمت کرنے کی صلاحیت رکھنا جرم نہیں خدا کی نعمت ہے جس کو ایشور نے دنیا میں اکیلا بنایا ہے مال و زر نہیں دیا ہے خوشی میں مسرور ہونے والا اور دکھ میں گلے لگا کر رونے والا ساتھی نہیں دیا ہے دنیا کے الفاظ میں جسے اس نے دکھیا بنایا ہے اس کی زندگی میں اس نے ایک عظیم الشان راز بھر دیا ہے۔ طاقت کی لافانی بے چینی کی تڑپتی

ہوئی آندھی اس کے دل میں سمو کر رکھ دی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے نہ سمجھے شاید دنیا بھی اسے نہ سمجھے پھر بھی وہ نہیں ہے ایسی بات نہیں۔ وہ ہے ضرورت ہے۔ صرف اس کو سمجھنے کی۔

پگڈنڈی تم ایشور کی اُنہیں مخلوقات میں سے ایک ہو۔ تمہاری تخلیق اس لئے نہیں ہوئی کہ تم ایک کی ہو کر رہو۔ ایک کے لئے جیو اور ایک ہی کے لئے مرو۔ نہیں تم زمین پر اپنا بہت بڑا مقصد لیکر آئی ہو۔ جیٹھ کی دہکتی ہوئی لو میں۔ بھادوں کی موسلا دھار بارش میں۔ اور خزاں میں اسی طرح لیٹی رہ کر تمہیں بے شمار انسانوں کو گھر سے باہر اور باہر سے گھر پہونچانا پڑے گا۔ تہذیب وتمدن کی بقا کی خاطر حیات کے سکھ کے لئے۔ دنیا کی بھلائی کے لئے تمہیں بڑی سے بڑی قربانی کرنی پڑے گی۔ تمہارا کوئی نہیں ہے اس لئے کہ سب ہی تمہارے ہیں۔ تم کسی کی نہیں ہو۔ اس لئے کہ تم سب کی ہو۔

—— تم دنیا کی ایک عظیم الشان ہستی ہو۔

آج سے پہلے میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ وجہ یہ تھی پگڈنڈی میری صاف بیانی کو معاف کرنا کہ ہماری روح سوئی ہوئی تھی صرف بدن جاگتا تھا تم نہیں سمجھتی تھیں کہ تم کون ہو۔ کس لئے آئی ہو۔ تم دنیا کی ہر اُس راہ پر چلنا چاہتی تھیں۔ آج خواہ کسی وجہ سے ہو تمہیں اپنی سابقہ زندگی سے بے چینی ہو رہی ہے۔ تمہیں اپنے سے نفرت ہو رہی ہے تم آج لامحدود فضا میں کودنے جا رہی ہو —— کچھ کرنے جا رہی ہو تمہاری روح بیدار ہو گئی ہے۔ ان باتوں کے کہنے کا مجھے آج ہی موقعہ ملا ہے

پگڈنڈی تم ایسا نہ سمجھنا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر میں تمہاری پوجا کرتا ہوں۔ پھر بھی اپنے کو تمہارے آگے کھڑا کر کے میں تمہاری روح کے نشو و نما کو روکنا نہیں چاہتا۔ میں تم پر اپنا عکس ڈال کر اُسے گندہ بنانا نہیں چاہتا۔ تمہارے سنگیت میں داخل ہو کر میں بے سرا بننا نہیں چاہتا۔ میں بڑے جوش و ولولہ سے تمہیں جہان سے رخصت کرتا ہوں۔ جاؤ۔ دنیا میں جہاں تمہارا فائدہ زیادہ ہو سکے وہاں جاؤ۔ اور اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقف کر دو۔ یہی میری گذارش ہے یہی میرا پیغام ہے ——یہی میرا——

صرف ایک بات اور کہنی ہے میری سنگدلی کو بھول جانا۔ ہو سکے تو معاف کر دینا۔ میرا ابھی دل ہے۔ اس میں بھی تھوڑا رس ہے۔ مگر میں نے جان بوجھ کر اسے سکھا دیا۔ اسے آنکھوں میں نہیں آنے دیا۔ ہونٹوں پر سے پونچھ ڈالا۔ تمہارے فرض کی راہ کو میں اپنے آنسوؤں سے تر نہیں بنانا چاہتا۔ پگڈنڈی میری حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ اگر نہ سمجھ سکو تو ...... تو سب کچھ بھول جانا۔

دنیا تمہاری راہ دیکھ رہی ہے۔ خلقت تمہاری منتظر ہے جاؤ۔ اپنا فرض پورا کرو۔ دنیا اگر تمہیں کچلے تو تڑپنا نہیں۔ بھول جائے تو سسکنا نہیں۔ بھولے ہوئے مسافروں کو گھر پہنچا دینا۔ جو گھر چھوڑ کر پردیس جاتے ہوں ان کی امداد کرنا جب تک جینا خوش رہنا کبھی کسی کے لئے رونا نہیں۔ اور —— ایک بات اور —— اگر تمہارے دل میں کبھی محبت کے جذبات آجائیں تو کوشش کر کے اپنی پوری قوت لگا کر اسے نکال ڈالنا

اگر نہ نکال سکو تو پھر وہاں سے کہیں دور۔ بہت دور چلی جانا۔ پگڈنڈی۔ خدا حافظ — تم اپنے روشن مستقبل میں دھندلے ماضی کو ڈبو دینا۔ سب کچھ بھول جانا۔ بڑ دادا اور رامی کے کنویں کو بھی بھول جانا۔ صرف یہی یاد رکھنا کہ تم کون ہو۔ اور تمہارا فرض کیا — بس جاؤ۔ خدا حافظ — ایشور تمہیں قوت عطا کرے۔"

کنواں چپ ہو گیا۔ آدھی رات کی خاموشی میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آواز گونج رہی ہے۔ میں کچھ بول نہیں سکی۔ سوچ بھی نہ سکی عجیب و غریب حالت ہو گئی۔ نہ جانے کیا سونگھ گیا۔ اس کے آخری الفاظ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بجلی سے لکھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے "بس جاؤ — خدا حافظ۔ ایشور تمہیں طاقت عطا کرے۔"

ٹھیک ٹھیک یاد نہیں آتا۔ کتنے دن ہوئے پھر بھی ایک زمانہ گذر گیا میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر رہ رہ کر آج بھی ناچنے لگتا ہے۔ کانوں میں وہ الفاظ اب بھی گونج اٹھتے ہیں۔

اب میں راجدھانی کا شاہی راستہ ہوں۔ دونوں طرف سہیلیوں کی طرح دو فٹ پاتھ ہیں۔ دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے دونوں طرف درختوں کی قطاریں ہیں۔ روشنی کے لئے بجلی کے کھمبے ہیں۔ اور نہ جانے کتنی نایاب چیزیں ہیں۔ روز میرا سنگار ہوتا ہے۔ میری دیکھ ریکھ پر ہزاروں روپئے خرچ کئے جاتے ہیں۔ راج کی طرح میرا خیال کیا جاتا ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے بس میں ہی میں ہوں — میں شہر کی جان ہوں۔ اس کے خون کا بہاؤ مجھ سے ہی ہو کر چاروں طرف دوڑتا ہے۔

میں تہذیب و تمدن کا منبع ہوں۔ دار الخلافہ کی جان ہوں۔ اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ سوچنے کو بھی فرصت نہیں ملتی انسانوں کے سمندر کی بے پناہ لہریں مجھے روندتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف نکل جاتی ہیں۔ میں اُف تک نہیں کرتی۔ اتنی بھیڑ میں مجھے اپنا کہنے والا ایک بھی نہیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی میرا ہونے والا کوئی نہیں — کوئی نہیں جو میری جلتی ہوئی زندگی پر ہمدردی کے دو بوند چھڑک دے۔ پھر بھی میں مایوس نہیں ہوتی۔ خوش رہنے کی کوشش کرتی ہوں مصیبتوں کے شعلوں پر مسکراہٹ کی راکھ بکھیرتی رہتی ہوں۔ ہونٹوں پر دل کو چھپائے رکھتی ہوں۔ جہاں تک ہوتا ہے اس نے جو کچھ کہا تھا سب کرتی ہوں۔ صرف ایک ہی بات نہیں ہوتی۔ اسے بھول نہیں سکتی۔

امرائی کی چھاؤں میں گھاسوں اور پتوں پر کاوہ جیون پپیہوں کے گانے بیلوں کا جھگڑا ابڑ داوا کی کہانیوں اور .... اور کیا کہوں۔

کتنی باتیں ہیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں۔ میرے جیون سنگیت کی تان لوٹ کر سُر پر آتی ہے۔ آکر پھر لوٹ جاتی ہے۔ مگر کسی کا سُر نہیں ملتا۔

یہ پرانی تاریخ ہے — کوئی کیا جانے — ایک زمانہ تھا جب میں ایسی نہیں تھی —

ہماری زیرِ طبع کتابیں

۱۔ ٹھوکریں۔ (افسانے) ۔۔۔ اشفاق حسین۔ ایم اے
۲۔ ٹیگور کا فلسفہ تمدن و سیاست۔ محمد عاقل علی خاں ایم اے
۳۔ سنگم (افسانے) ۔۔۔ شبیر حسین قیس
۴۔ روس کے مسلمان ۔۔۔ سبط حسن
۵۔ ریڈیو ڈرامے اور خاکے ۔۔۔ محمد مظفر حسین شمیم
۶۔ چین کے مسلمان ۔۔۔ خواجہ معین الدین بی اے
۷۔ خیر و شر ۔۔ (افسانے) ۔۔۔ افضل عابدی
۸۔ نوید ۔۔ (مجموعۂ کلام) ۔۔۔ صاحبزادہ میکش
۹۔ ٹوٹے ہوئے گھر۔ (ڈرامے) ۔۔۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی
۱۰۔ سُرخ فسانے۔ (افسانے) ۔۔۔ ڈاکٹر محمد صادق
۱۱۔ فلسفۂ اقبال ۔۔۔ علی سردار جعفری
۱۲۔ اشارے ۔۔ (افسانے) ۔۔۔ غوث محی الدین
۱۳۔ کمند ۔۔ (؍؍) ۔۔۔ ڈاکٹر محمد صادق
۱۴۔ ترقی پسند ادب ۔۔۔ علی سردار جعفری

ناشر

اِشاعت گھر

حیدر آباد دکن

ترقی پسند ادب

۱	سُرخ سویرا۔ (مجموعۂ کلام)	مخدوم محی الدین	۱؍۱۲
۲	یہ کس کا خون ہے؟۔ (ڈراما)	علی سردار جعفری	۸؍
۳	یہ امرت ہے۔ (")	خواجہ احمد عباس	۶؍
۴	اجرتی محنت اور سرمایہ	کارل مارکس	۱۲؍
۵	چند دن لینن کے ساتھ	میکسم گورکی	۴؍
۶	پگڈنڈی۔ (افسانے)	افضل عابدی	۱؍۸
۷	منجدھار۔ (")	غوث محی الدین	؍
۸	پرواز۔ (مجموعۂ کلام)	علی سردار جعفری	۱؍۸
۹	رگ سنگ (")	علی جواد زیدی	۱؍
۱۰	تعارف	جواں فکر حیدرآبادی شعرا کا کلام	۸؍

دیگر مطبوعات

۱۱	ہندوستانی ریاستوں کا مستقبل	خواجہ معین الدین	۴؍
۱۲	نجات کا راستہ	سی راج گوپال چاری	۱۰؍
۱۳	جنگ کی کہانی	افضل عابدی	۱۰؍
۱۴	نیا ادب شمارہ نمبر (۴)	انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان	؍

ناشر

اشاعت گھر۔ حیدرآباد دکن

ملنے کا پتہ

دکن بک ڈپو۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن

اِشاعت گھر
امپریل پوسٹ آفس لین حیدرآباد دکن
دکن بک ڈپو
عابد روڈ حیدرآباد دکن
پیوپلس بک ہوز
امپریل پوسٹ آفس لین حیدرآباد دکن

Title Printed at Sri Laxmi Art Press, Hyd. Dn